باب اول

سوانحی پس منظر

ولادت وخاندانی پس منظر

سید محمد عابد ریاست اتر پردیش کے ضلع جالوں کے ایک گاؤں اورئی میں ۱۷ نومبر ۱۹۳۲ء کو پیدا ہوئے۔ یہ تاریخ پیدائش ان کے ہائی اسکول کے سارٹیفکیٹ کے مطابق ہے جب کہ ان کے والد کی ڈائری جو انہیں ۳۰ ستمبر ۲۰۱۰ء کو ملی تھی اس میں ان کی تاریخ پیدائش بجائے ۱۷ نومبر کے ۲۷ نومبر ہے۔ وہ لکھتے ہیں

> اس نوٹ کے مطابق میری تاریخ پیدائش ۲۷ نومبر ۱۹۳۲ء ہے (اگر چہ ہائی اسکول سرٹیفکٹ میں ۱۷ نومبر ۱۹۳۲ء درج ہے۔)(۱)

سید محمد عابد کا خاندان کس ریاست سے یوپی منتقل ہوا اس کا ذکر انھوں نے نہیں کیا۔ بس اتنا لکھا کہ

> میرے آباء واجداد نہ جانے کہاں سے کب اور نہ جانے کیوں یوپی میں ایک جگہ پہنچے۔(۲)

ان کے خاندان کے سربراہ کا نام ممریز تھا جنھوں نے سرائے ممریز آباد کیا تھا۔ اس خاندان کا ایک حصہ مظفر نگر اور محی الدین پور (الہ آباد) آ گیا۔ عابد سہیل کے پردادا کے والد سید سلطان حسن تھے جو مظفر نگر کی تحصیل کھتولی کے تحصیل دار تھے۔ 1857 کی جنگ آزادی میں جب عابد سہیل کے خانوادے نے ہندوستانیوں کے ساتھ آزادی کا نعرہ بلند کیا تھا تو انگریزی حکام کی جانب سے کارروائی میں سید سلطان حسن بھی گرفتار ہو گئے۔ جب انھیں پھانسی دینے کا وقت آیا تو سلطان حسن نے بتایا کہ وہ کھتولی کے تحصیل دار ہیں اور اپنا پستول دکھایا، جس کے بعد انھیں رہا کر دیا تھا۔ ان کے دو بیٹوں میں بڑے بیٹے سید امیر حسن عابد سہیل کے پردادا تھے جن کی وفات ۲۰ اکتوبر ۱۹۲۵ میں ہوئی۔ امیر حسن کے تین بیٹوں میں پسرِ اکبر سید وزیر حسن عابد سہیل کے دادا تھے۔ انھوں نے قانون گو اور بعد میں نائب تحصیل دار کے عہدہ تر تک قی حاصل کی تھی۔ سید وزیر حسن کو بھی خدا نے تین بیٹے عطا کئے اور حسن اتفاق سے ان کے سب سے بڑے بیٹے یعنی سید ظفر حسن کے گھر میں عابد سہیل کی ولادت ہوئی۔ عابد سہیل کو اپنے داد سے بے انتہا محبت تھی اور ان کے دادا بھی عابد سہیل پر جان چھڑکتے تھے۔ یک جگہ اپنے بچپن کو یاد کرتے ہوئے لکھتے ہیں

۔۔۔عصر اور مغرب کی نمازیں انھوں نے (دادے ابا) گھر پر ہی پڑھیں ، پھر مجھ سے کھیلتے اور چھیڑتے رہے کبھی گدگداتے ،کبھی گدگدانے کے لئے انگلیاں دکھاتے اور میں اسی میں لوٹ پوٹ ہو جا تا ۔ وہ مجھے بہت چاہتے تھے اور میں ان کی چھیڑ چھاڑ اور گدگدانے کا اس قدر عادی ہوگیا تھا کہ وہ کہیں چلے جاتے تو میں انھیں برابر اسی حوالے سے یاد کرتا ۔" (۳)

دادے ابا کا انتقال بھی محی الدین پور سن ۱۹۴۵ ء میں ہوا، عابد سہیل کے دادا کی پشت پر ایک پھوڑ انکلا تھا جس کو اور ئی کے ڈاکٹر جان نے لاعلاج بیماری بتایا تھا جس کا دوبار آپریشن بھی ہو چکا تھا اور دونوں دفعہ سید وزیر حسن روبصحت ہو گئے تھے لیکن تیسری مرتبہ اس پھوڑے پر کوئی دوا کارگر ثابت نہیں ہوئی ۔ عابد سہیل کے لئے یہ پہلا غم تھا جس نے انھیں کم ہی سہی مگر احساس محرومی سے آشنا کرایا تھا ۔ اپنی خودنوشت کے صفحہ ۱۳۱ پر اس غم کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ۔

"۔۔۔دادے ابا کا انتقال ہوا تو میں خاصہ چھوٹا تھا ۔ یہ عمر غم پالنے کی نہیں ہوتی اور غم ہی کیا خوشیاں بھی گزشتنی ہوتی ہیں ۔ کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کا پیچھا کر رہے ہوں لیکن دادے ابا کے بغیر محی الدین پور سونا سونا لگتا ۔ نصیر چچا ہوں یا ماجد دادا ، لطیف تائے ابا ہوں یا شکر قند والے دادا سب طرح طرح سے دلجوئی کرتے اور کوشش کرتے کہ میں ہر وقت کسی نہ کسی کام میں مصروف رہوں ۔۔۔۔ پھر بھی دادے ابا یاد آتے ہی رہتے ،مگر اتنے نہیں جتنے بعد میں آئے اور ان یادوں میں اس وقت محرومی کا عنصر بھی اتنا نہ تھا ۔ ان کے نہ ہونے کے معنی میں نے پوری طرح تو ابا کے انتقال کے بعد سمجھ میں آئے ۔" (۴)

عابد سہیل کے والد سید ظفریاب حسن کی پیدائش ۸ فروری ۱۸۹۷ ء اور وفات ۲۱ اپریل ۱۹۴۷ ء میں ہوئی ۔انھوں نے اٹاوہ کے اسلامیہ کالج سے ہائی اسکول ۱۹۱۳ ء میں پاس کیا تھا ۔ بقول عابد سہیل

میرے خیال میں ابا نے ہائی اسکول ۱۹۱۳ ء کے آس پاس کیا ہوگا کسی نے مجھے بتایا تھا کہ ابا ہائی اسکول پاس کر کے آئے تو لوگ دیکھنے آتے تھے کہ ہائی اسکول پاس لڑکا کیسا ہوتا ہے ۔ (۵)

ان کی ملازمت کا سلسلہ جون ۱۹۱۸ میں شروع ہوا تھا ۔ کس عہدے پر تقرر ہوا تھا اس کے سلسلہ میں عابد

سہیل لکھتے ہیں

ان کا تقرر بطور اپرنٹس ہوا تھا لیکن یہ لفظ ٹھیک سے پڑھا نہیں جاتا۔(۶)

دوسری جگہ بچپن کے زمانے کی پختہ ہو رہی یادداشت کا سہارا لیکر رقمطراز ہیں:-

ان دنوں ابا کچہری میں زیادہ سے زیادہ ہیڈ کلرک رہے ہوں گے کیوں کہ بالا دین یا کوئی اور چپراسی ان کے ساتھ بستہ لے کر نہیں آتا تھا۔(۷)

عابد سہیل کے والد ترقی کر کے کلکٹریٹ میں پیش کار (چیف ریڈر) ہو گئے تھے اور دوسری جنگ عظیم کے شروع ہونے کے بعد راشننگ کا نظام نافذ ہوا اور انھیں ایمانداری کی بنا پر افسر بنا دیا گیا۔ عابد سہیل کے والد نے دو شادیاں کی تھیں ان کی پہلی زوجہ کا انتقال ۲۲ فروری ۱۹۲۴ء کو ہوا تھا۔ ان سے تین اولادیں تھیں اختری خاتون، انوری خاتون اور فیاض حسن۔ فیاض حسن بڑے بھائی تھے جو فوج میں تھے۔ لیکن وہاں سے بھاگ آئے تھے اور پکڑے جانے کے خوف سے خود پر دیوانگی طاری کر رکھی تھی اور بقول عابد سہیل "جھوٹے پاگل پن اور معصومانہ حرکتیں" کیا کرتے تھے۔ یعنی کسی کو نقصان نہیں پہنچاتے تھے۔ شرارتوں سے لوگوں کو تنگ کرتے تھے۔ عابد سہیل کا ننہیال مذہبی اور علمی گھرانہ تھا۔ اپنے ننہیال کے بارے میں رقمطراز ہیں:-

"میرے ننہیال کے سارے بزرگ اور خالو کے خاندان کے افراد حضرت مولانا عبدالعلیم آسی، سجادہ نشین خانگاہ رشیدیہ اور ان کے جانشین سید شاہ شاہد علی سبز پوش اور ان کے جانشین اور صاحب زادے سید مصطفی علی صاحب اور ان کے خلفاء اور موجودہ سجادہ نشین مولانا مفتی عبدالرحمان سے ارادت رکھتے تھے۔(۸)

ان کے پرنانا مولوی محمد عمر غازی پور کے ممتاز وکیل تھے۔ ان کے بیٹے یعنی عابد سہیل کے نانا کا نام محمد صوفی تھا جو ۱۸۸۰ء کے آس پاس غازی پور سے جونپور آ گئے تھے۔ محمد صوفی کے چچازاد بھائی مولوی محمد عظیم جن کی ہمشیرہ سے محمد صوفی کی شادی ہوئی تھی، کا شمار بڑے اور ممتاز وکیلوں میں ہوتا تھا۔ محمد صوفی کے دو بیٹے محمد عقیل اور محمد شفیع تھے اور دو بیٹیاں عائشہ خاتون جو عابد سہیل کی والدہ تھیں ان سے بھی تین اولادیں ہوئیں سید محمد عابد (عابد سہیل)، ڈاکٹر محمد عمران اور میمونہ خاتون (نجمہ) جو ان سے بارہ سال چھوٹی تھیں اور علی گڑھ میں دودھ ابالتے وقت ساری میں آگ لگ جانے کی وجہ سے انتقال کر گئی تھیں۔ عابد سہیل کی والدہ کو علم و ادب سے دلچسپی وراثت میں ملی تھی۔ وہ اکثر ناول اور رسالے پڑھا کرتی تھیں۔ اور اس زمانے کے مشہور رسالہ خاتون مشرق، عصمت، کامیاب وغیرہ ان

کے مطالعہ میں رہتے تھے۔ اپنے شوہر کی بیحد مطیع وفرماں بردار اور اولادوں کے لئے نہایت رحمدل خاتون تھیں۔ فیاض حسن کے گھر کے آنے جانے پر جب ان کے والد نے روک لگادی تھی تو عائشہ خاتون سوتیلی ماں ہونے کے باوجود بضد تھیں کہ ان (فیاض) کو گھر آنے دیا جائے اور جب ایک دن فیاض دروازہ کھٹکھٹانے لگے اور نہ کھلنے پر کھانا مانگتے ہوئے بولے کہ ایک دن سے کچھ نہیں کھایا ہے تو عائشہ خاتون رونے لگیں۔ شوہر کی پیروی کی خلاف ورزی ان کا شعار نہیں تھا لیکن بیٹے کی محبت بھی انھیں بے چین کئے ہوئے تھی۔ لہذا انھوں نے منیر کی اماں سے کھانا نکلوا کر کھڑکی سے لٹکا دیا۔ عابد سہیل کی ساخت و پرداخت میں ان کی ماں کا اہم کردار رہا ہے۔ بچپن میں وہ اماں کے ساتھ میلاد و مجلس میں بھی جایا کرتے۔ ان کی والدہ مجلسوں میں گریہ کرتیں جسے دیکھ کر عابد سہیل بھی رونے لگتے۔ عابد سہیل کے دادھیال میں مذہب کی پیروی اتنی شدومد کے ساتھ نہ کی جاتی ہو مگر اس زمانے کی تہذیب وروایت کی پاسداری کا بھرپور خیال رکھا جاتا تھا۔ عابد سہیل لکھتے ہیں

> ابا مذہبی آدمی نہیں تھے، عید بقرعید کے علاوہ میں نے انہیں نماز پڑھتے بھی نہیں دیکھا لیکن ان کا رہن سہن بالکل مسلمانون کا تھا، سیدھے سچے مسلمانوں کا۔ وہ گھر سے باہر شیروانی پہنے بغیر نہیں نکلتے تھے...... میں نے ان کو نیکر یا جانگھیہ پہنے گھر پر کبھی نہیں دیکھا۔ (۹)

عابد سہیل کے والد زیادہ پڑھے نہیں تھے اور اس زمانے میں پڑھائی کا اتنا زور بھی نہیں تھا۔ وہ اسپورٹس مین تھے کرکٹ کھیلنا بہتر جانتے تھے لیکن ہاکی میں سنٹر فارورڈ پازیشن کے بہت اچھے کھلاڑی تھے اس کی وجہ سے ان کے اسکول میں انھیں نویں کلاس میں دوبار فیل کیا گیا کہ اگر یہ نواں پاس کرنے کے بعد ہائی اسکول میں کامیاب ہو گئے تو اسکول سے چلے جائیں گے اور ہاکی ٹیم کمزور پڑ جائیگی اسکے علاوہ ہرڈل ریس (Hurdle Race) میں ان کا ثانی نہیں تھا۔ عابد سہیل کے والد صرف ہائی اسکول پاس تھے لیکن یہ سند بھی اس زمانے میں بہت اہمیت کی حامل تھی۔ اردو ادب سے بھی انھیں زیادہ رغبت نہیں تھی اگر عابد سہیل کی زبان میں کہیں تو

> ابا کو ادب اور شعر وشاعری سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن وہ ہر سال ہاکی ہنڈ ٹورنامنٹ کے علاوہ ٹاؤن ہال میں ایک مشاعرے کا اہتمام کرتے تھے۔ (۱۰)

عابد سہیل کے والد کا انتقال لکھنو میں ہوا جب وہ اپنی اہلیہ کی شدید بیماری کی خبر سن کر وہاں گئے تھے۔ اس وقت عابد سہیل ۱۵ سال کے تھے اور شعور اتنا پختہ نہیں ہوا تھا کہ وہ اس محرومی کا اندازہ لگا سکیں بلکہ انھوں نے اپنے غیر پختہ شعور میں والد کے انتقال کی خبر پر معمولی سی مسرت کے احساس کا ذکر کیا ہے لیکن ساتھ ہی اس عمل کو اپنی

کمینگی سے جوڑتے ہوئے زندگی بھر اس پر پشیمان بھی رہے۔ لکھتے ہیں:-

”دو تین دن بعد ابا کی شدید علالت کا تار آیا تو منیر کی اما پھوٹ پھوٹ کے رونے لگیں۔ اس طرح کے تار کا مطلب کچھ اور ہی ہوتا تھا۔ رویا میں بھی تھا لیکن غم کی دبیز چادر نے مجھے اس طرح نہیں لپیٹا تھا جیسے وہ بعد کی تقریباً ساری زندگی لپیٹے رہی۔ نہ صرف یہ بلکہ ایک طرح کے سکون، بلکہ معمولی سی مسرت کا احساس بھی ہوا تھا کہ اب کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں۔ بعد کی ساری زندگی جس طرح گزاری اور دنیا نے جیسا کچھ سلوک کیا اس کے لئے میں نے خود کو ہمیشہ اس وقت کی معمولی سی مسرت کی اپنی کمینگی سے جوڑ کر ہی دیکھا ہے۔ (۱۱)

اس صدمہ نے عابد سہیل کو دوبارہ محرومی کا احساس دلایا تھا جس کی شدت دادے ابا کے انتقال کے بعد کچھ زیادہ رہی ہوگی کیوں کہ ابھی بھی عابد سہیل کو حیرانی اس بات پر تھی کہ ایک شخص کے چلے جانے سے ساری دنیا کیونکر بدل سکتی ہے۔ جس کا اظہار وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

”لکھنو پہنچا تو سیوم ہو رہا تھا۔ اما مجھے چمٹا کر جس طرح روئیں اور دوسروں نے جس طرح دلجوئی کی اس سے یکا یک احساس ہوا کہ تحفظ کے اس ہالے سے جو اس وقت تک مجھے اپنے سائے میں لئے تھا یکا یک محروم ہو گیا ہوں اور میں حیران حیران نظروں سے ایک ایک کو دیکھ رہا تھا اور سمجھ میں نہ آتا کہ صرف ایک شخص کے رخصت ہو جانے سے ساری دنیا کیسے بدل سکتی ہے۔“ (۱۲)

عابد سہیل ۱۹۴۰ء میں بھوپال میں اپنی پھوپھی کے یہاں رہنے لگے۔ ان کی پھوپھی بہت ہی خلیق تھیں، سب کا بہت خیال رکھتی اور چاہتی تھیں۔ ان کے پھوپھا جناب حشمت صاحب کشیدہ قامت، دبلے پتلے اور جنکا رنگ سرخی مائل تھا اور نورانی چہرہ پر ریش حسن میں اضافہ کا باعث تھی۔ عابد سہیل کے دو پھوپھی زاد بھائی اور ایک بہن تھیں عابد ان سے بے پناہ محبت کرتے تھے اور انکے ساتھ ساتھ کھیلتے، لڑتے جھگڑتے اور پھوپھا کی ڈانٹ پھٹکار سنتے۔ یہ سب عابد سہیل کو اچھا لگتا تھا ان سب میں محبت کا عنصر ہوتا تھا۔ پھوپھی کو دیکھتے ہی عابد سہیل کا چہرہ بہ مثل گلاب ہو جاتا۔ وہ انکی محبت، جو کبھی وہ ظاہر نہ کرتی تھیں اور انکی باتیں، جو کم کرتی تھیں، کام کرنا گھر میں گھومنا یہ سب عابد سہیل کو بہت اچھا لگتا تھا۔

عابد سہیل کی ابتدائی تعلیمی کا سفر اورئی سے شروع ہو کر بھوپال کے شاہجہانی اسکول تک پہنچا۔ بہت کم عرصہ

میں عابد سہیل کا حلقہ احباب وسیع ہو گیا۔ یہ عمر ہی دوست بنانے اور دوستی کرنے کی ہوتی ہے۔ان دنوں کی تصویر آخر عمر تک ذہن پر نقش رہتی ہے۔حلقہ احباب میں کچھ خاص تو کچھ عام ہوتے ہیں جن میں عابد سہیل کے لئے اس حلقہ احباب میں تین خاص تھے" چھوٹے میاں، شمھو اور احمد سہیل"۔ چاروں دوست ساتھ میں اسکول جاتے تھے، کبھی خوش کبھی غمگین ہوتے اور زندگی کے ان دنوں سے لطف اندوز ہوتے جس کی تمنا انسان کے دل میں تا قیام حیات رہتی ہے۔ بچوں کی لڑائیاں نوک جھوک ان لوگوں میں بھی مشترک تھی۔ایک دن کا قصہ یو ہیں کہ چاروں اسکول کی جانب رواں دواں تھے راستہ میں ایک پھل پر نگاہ پڑی،جس کو سب نے کھالیا۔اس پھل کی شکل مکو کے پھل جیسی تھی۔ ان لوگوں نے اس پھل کو جی بھر کے کھایا اور اسکے بعد تمبا کوں نوشی بھی کی یعنی سگریٹ کے کش بھی لئے ،لہذا اسکول تک پہنچتے پہنچتے چاروں بیمار ہو گئے اور اسکول سے واپس آ گئے لیکن افسوس ناک یہ ہوا کہ اس میں احمد سہیل دار فانی کو الوداع کہہ گئے۔

سید محمد عابد کیسے عابد سہیل بنے خود فرماتے ہیں:

> "سہیل میرا بے حد پیارا اور چہیتا دوست تھا،اس کے غم کا نشتر اس قدر گہرا تھا کہ اسی دن اسی وقت سید محمد، عابد سہیل ہو گیا۔" (۱۳)

اور پھر یہ جملے:

> " اب کہاں جاؤ گے سہیل، اب تو ساری زندگی کا ساتھ نبھانا پڑیگا، میں تمہیں اپنے آپ سے ایک لمحہ کے لیے جدا نہ ہونے دوں گا۔"(۱۴)

مشہور افسانہ نگار رتن سنگھ ان کے سہیل نام کے متعلق رقم طراز ہیں :

> "عابد سہیل ۲ ۱۹۳ء میں اورئی ضلع جالون میں پیدا ہوئے۔نام تھا سید محمد عابد، تھوڑا بڑا ہونے پر بھوپال میں سہیل نام کے ایک لڑکے سے ایسی دوستی ہوئی کہ یہ دونوں ایک جان دو قالب ہو گئے، پھر سہیل کا اچانک انتقال ہو گیا تو اپنے دوست کی یاد کو دل کے گوشوں میں ہمیشہ تازہ رکھنے کے لئے"سہیل" اپنے نام کے ساتھ جوڑ لیا اور اس طرح یہ عابد سہیل ہو گئے"۔(۱۵)

ایک درد مند دل کی فنکارانہ زندگی کی شروعات ایسے چھوٹے چھوٹے واقعات سے ہوتی ہے اور گزرتے وقت کے ساتھ اس پر فکر مندی اور ہوش مندی کی ایسی پرت چھڑتی ہے،جس سے وہ مضبوط ہوتا چلا جاتا ہے۔

عابد سہیل شادی سے پہلے اخبار "قومی آواز" میں ملازمت کرتے تھے، انہیں یہاں سے ۸۰ سی روپے ملتے تھے، اس کے علاوہ سو روپے دوسرے ذرائع سے مل جاتے تھے لیکن ذمہ داریاں بہت تھیں، جن میں بیوہ ماں، بھائی اور بہن کی پڑھائی شامل تھی۔ اس کے علاوہ خود ان کے اخراجات۔ ان سب ذمہ داریوں کے تحت یہ ابھی شادی کے لئے تیار نہ تھے لیکن درمیان میں رضیہ سجاد ظہیر آ گئیں اور انھوں نے شادی کرا کے دم لیا۔

عابد سہیل کا نکاح ۱۷، اپریل ۱۹۵۸ء میں ہوا، ان کی اہلیہ ایک پڑھی لکھی خاتون تھی۔ ان کا نام انیس نصرت ہے، شادی کے فوراً بعد ایک خبر لوگوں تک پہنچی کے عابد اپنے سسرال والوں سے ۳۵ بیگھے زمین اور تین ہزار روپئے کی مانگ کر رہے ہیں ساتھ ہی رہائشگاہ اور اسکوٹر کی بھی مانگ ہے۔ چنانچہ آپس میں اختلافات ہوئے، اس لیے انیس نصرت شادی کے چھ سال تک مائکے میں رہیں۔ معاملات میں بہتری کے بعد وہ ۹ مئی ۱۹۶۴ء کو عابد سہیل کے گھر آئیں۔ عابد لکھتے ہیں:

"میرا نکاح ۱۷اپریل ۱۹۵۸ء کو ہوا اور انیس میرے یہاں رہنے کے لئے ۹ مئی ۱۹۶۴ء کو یعنی چھ سال بعد آئیں لیکن اس میں ان کا کوئی قصور نہ تھا۔" (۱۶)

عابد سہیل ایک جگہ اپنی شادی کے بارے میں رقم طراز ہیں:

" آشیانہ شاخ نازک پر بنا تھا اور جڑوں میں بھر دی گئی تھی بارود، چناچہ کبھی پلاسٹر جھڑتا، کبھی اینٹ گرتی، کبھی دوسری اور پھر خشت باری کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ ماشااللہ جاری رہا۔" (۱۷)

انیس نصرت، عابد سہیل کی زندگی میں بحیثیت خاتون خانہ آئیں۔ پوری زندگی وہ ہر دکھ اور سکھ میں عابد سہیل کی رفیق بنیں۔ انیس نصرت، رفیق زندگی کے ساتھ ساتھ ایک بہترین دوست، بے نظیر ساتھی اور ہمراز ثابت ہوئیں۔ باشعور اور ذہین خاتون ہونے کی بنا پر انھوں نے شادی کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم۔اے۔ کیا اور ایک مثالی خاتوں بنیں۔ عابد سہیل اپنی رفیق حیات پر رشک کرتے تھے۔ عابد سہیل کی تینوں اولادیں اپنے والدین کی فرمابردار ہیں اور زندگی کامیابی اور خوشی کے ساتھ گزار رہے ہیں۔

عابد سہیل ازدواجی زندگی میں قدم نہیں رکھنا چاہتے تھے، اس کی وجہ گھر کے وہ حالات تھے، جس کا اثر ان کی ازدواجی زندگی پر پڑا جس کے احساس انھیں بعد آخر عمر تک رہا۔ یہ اپنی بیوی کو اشاروں، کنایوں میں بہت کچھ کہتے۔ انیس نصرت بہت غصہ والی تھیں۔ انھیں ہائی بی پی کی شکایت تھی لیکن یہ ایک کان سنتے دوسرے سے نکال دیتے تھے۔ عابد سہیل صاحب کی تین اولادیں ہیں، جن کے نام صبا، ساجد اور زریں سہیل ہیں۔ بڑی بیٹی صبا کی

شادی مقبول احمد قریشی سے ہوئی ہے۔ ان کے دو فرزند ہیں، بلال ایم قریشی اور علی عمر قریشی۔ عابد سہیل کی بہو کا نام عائشہ احمد ہے جو انکے بیٹے ساجد کی اہلیہ ہیں۔ ساجد کا کمپیوٹر کا کاروبار ہے۔ ساجد کے تین بچے ہیں جن کے نام احمد سہیل، عبداللہ سہیل اور آسیہ سہیل ہیں۔ عابد سہیل کی سب سے چھوٹی بیٹی زریں کا نکاح جاوید خان سے ہوا۔ زریں سہیل ہیرے جواہرات کی کسی کمپنی میں برانڈ منیجر ہیں اور جاوید خان ایئر فرانس سے وابستہ ہیں۔ ان کی دو اولادیں ہیں، جن کے نام زیان خان اور مریم خان ہیں۔

معروف ناقد و ادیب عابد سہیل کا انتقال ۲۶ جنوری ۲۰۱۶ء کو ہوا۔ عابد سہیل کا شمار ان بڑے ادیبوں میں ہوتا ہے، جنھوں نے اپنی عمدہ تحریروں سے ادب و صحافت کو روشن کیا۔ اسی ضمن میں پروفیسر طارق چھتاری لکھتے ہیں:

> "عابد سہیل صاحب نے اپنے افسانوں میں ایک نیا وژن دیا۔ ان کے خاکوں نے انسانیت کا درس دیا۔ ان کی ادارت میں شائع ہونے والے ماہنامہ "کتاب" نے نئے ادبی و نظری مباحث کو فروغ دیا۔ اپنی آپ بیتی میں انھوں نے بہت سے ان پہلوؤں کو منور کیا جو عام قاری کی نظروں سے اوجھل تھے۔ وہ بیک وقت ادیب صحافی بھی تھے خاکہ نگار و سوانح نگار بھی۔ ایسی ہمہ جہت شخصیت کے انتقال سے اردو کا نقصان ہوا ہی ہے ایک اچھا انسان بھی ہم سے جدا ہو گیا۔" (۱۸)

عابد سہیل کے انتقال پر ریاست کے گورنر رام نائک اور وزیر اعلیٰ اکھلیش یادو نے تعزیتیں پیش کیں۔ مختلف ادبی تنظیموں کی جانب سے تعزیتی نشستیں اور پروگرام کئے گئے۔ سب سے پہلا تعزیتی پروگرام ۲۸ جنوری ۲۰۱۶ کو اودھ نامہ کے بانی سید وقار مہدی رضوی نے اردو رائٹرس فورم کے تحت جے شنکر پرساد ہال، رائے اماناتھ بلی آڈیٹوریم قیصر باغ میں منعقد کیا۔

تربیت و تعلیم اور کھیل

عابد سہیل کی پرورش بہترین انداز اور بہترین ماحول میں ہوئی تھی، انھوں نے قران مجید کی تعلیم اپنی ماں سے لی۔ وہ اردو اور حساب مولوی صاحب سے پڑھتے تھے۔ عابد سہیل مولوی صاحب کو زیادہ پسند نہیں کرتے تھے۔ یہ مولوی صاحب کے آنے سے قبل اپنے پڑھنے والی کتابیں ہٹا دیتے اور انکے آنے کے بعد روتے اور ڈھونڈتے۔

ایک بار دادا نے دیکھا اور کہا:

"دیکھو مولوی صاحب آرہے ہیں جلدی سے کاپی چھپا دو"۔(۱۹)

عابد سہیل کے اندرون خانہ کئی زبانوں کا چلن تھا، ان کے گھر کے لوگوں کا تلفظ بہت اعلیٰ پائے کا تھا۔ اردو اور فارسی کے استعمال سے زبان میں چار چاند لگے ہوئے تھے۔ اورئی میں بندیل کھنڈی زبان کثرت استعمال میں تھی، اس کا اثر عابد سہیل پر بھی تھا اس لئے انہیں بھوپال بھیج دیا گیا۔

عابد سہیل اماں اور ابا کے ساتھ شہر بھوپال میں وارد ہوئے اور اپنے والد کی بہن کے یہاں قیام پذیر ہوئے۔ تعلیم کی ابتدا یہیں سے ہوئی، انکی پھوپھی کا مکان بھوپال کے محلہ بیسا ہزار کھڑکی میں تھا، انکے گھر سے کچھ فاصلہ پر ایک درسگاہ تھی جو انکی مادر علمی بن گئی اور دوسری درسگاہ شاہجہانی ماڈل اسکول جہاں پر انہوں نے اپنی تعلیمی سفر کو آگے بڑھایا۔

شاہجہانی ماڈل اسکول میں عابد سہیل کو چوتھے درجہ میں داخلہ ملا۔ عابد سہیل بچپن میں بہت مذہبی تھے۔ نماز پنجگانہ کے پابند تھے اور کئی پاروں کے حافظ بھی تھے۔ اپنی والدہ کے ساتھ مذہبی جلوس وجلسوں میں آیا جایا کرتے تھے۔ ایک بار عابد سہیل نے عیدل میلادلنبی کے موقع پر مولانا وارثی کی نعت ان ہی کے انداز میں پڑھی تھی۔ اس بات سے ان کی والدہ بیحد خوش تھیں۔ نعت کے مصرعے تھے

پیارے محمد آئے نبیؐ جی

بگڑ مری بن جائے نبیؐ جی

انکی روزہ کشائی بھی بھوپال میں ہوئی۔ عربی کا مضمون مذہبی ہونے کی بنا پر انکو پسند تھا۔ اسکول میں عربی کا کوئی استاذ نہیں تھا، محمد اسحٰق جو جغرافیہ کے مدرس تھے وہ مدرسے سے الگ ہٹ عربی پڑھاتے تھے، جیسا کہ بیشتر اسکولوں میں پڑھائی جاتی تھی۔ ابتدا میں قواعد کی جگہ چھوٹے جملے پڑھائے جاتے تھے۔ عابد سہیل کو پہلے دو روز کے اسباق جو انکو پڑھائے گئے وہ اس طرح یاد تھے:

سرت من البسرۃ الی الکوفۃ"

(سفر کیا میں نے بصرہ سے کوفہ تک)

دوسرے روز کا سبق:

"لسان العربی لسان القران ولسان الاسلام فتعلموہا"

زبان عربی قران کی زبان ہے، اسلام کی زبان ہے اس لئے آؤ اسے سیکھیں(۲۰)

عابد سہیل تعلیم کے حصول کے ساتھ ساتھ ثقافتی پروگراموں میں بھی سرگرم رہتے تھے اور انعامات بھی حاصل کرتے تھے۔ بھوپال سے جب اورئی لوٹے تو یہاں ڈی۔ اے۔ وی کالج میں داخلہ لیا اور وہاں بھی ادبی اور کلچرل پروگراموں میں حصہ لیتے۔ ایک پروگرام میں انھوں نے کاغذ کے پھول بنائے اور انعام حاصل کیا۔ بیت بازی میں اول آئے اور انعام کے مستحق ہوئے۔ تقریری مقابلوں کے ساتھ شعر کی بہترین ادائگی کے لئے بھی مستحق انعام قرار پائے۔ اسی ماحول میں وہ پروان چڑھے اور شعر و ادب کا انکا رشتہ قوی ہوتا گیا۔

بھوپال کے اسکول اورئی کے اسکولوں سے قدرے مختلف تھے۔ بھوپال میں انگریزی کے ساتھ اردو اور فارسی بھی پڑھائی جاتی تھی اور چھوٹے درجوں میں عربی پر توجہ دی جاتی تھی۔ یو۔ پی۔ میں انگریزی کے علاوہ ریاضی، تاریخ اور جغرافیہ کو کافی اہمیت حاصل تھی۔ عابد سہیل کے پاس داخلہ کے لئے ٹرانسفر سرٹیفکیٹ نہیں تھا، اس کے بغیر داخلہ نہیں ہوسکتا تھا لیکن بذریعہ ٹسٹ وہ ڈی۔ اے۔ وی کالج میں داخل کر لیے گئے جبکہ اس سے پہلے بھوپال میں بھی انکا درجہ یہی تھا۔ وہاں سے فرار ہونے کی بنا پر انکا سال ضائع ہوگیا۔ بھوپال کے قیام میں جب عابد سہیل کو حشمت پھوپھا کی گھڑی چرانے پر شرمندگی ہوئی تو وہ بغیر کسی کو اطلاع دیئے اورئی کے لئے نکل گئے مگر غلط ٹرین میں بیٹھ گئے لہٰذا قریب کے اسٹیشن پر اتر کر دوسری ٹرین کا انتظار کرنے لگے۔ اس اسٹیشن پر اورنگ آباد کے ایک مولوی صاحب اپنے بڑے بیٹے کو دفن کر کے لوٹ رہے تھے۔ عابد سہیل نے جب ان سے ٹرین کی تفصیلات معلوم کری تو انھوں نے ٹکٹ دیکھ کر بتایا کہ یہ پرانا ہوگیا ہے اور اس سے اورئی نہیں جا سکتے۔ مولوی صاحب مسلسل رو رہے تھے۔ جب عابد سہیل نے ان سے رونے کا سبب پوچھا تو انھوں نے اپنے بیٹے کی موت کا واقعہ سنایا اور یہ بھی کہا کہ اس کی شکل عابد سہیل سے بہت ملتی تھی مولوی صاحب نے کہا کہ اگر وہ چاہیں تو میرے ساتھ میرے گھر چلیں مجھے کچھ دن بعد واپس اورئی جانا ہے میں انھیں ان کے گھر چھوڑ دوں گا۔ عابد سہیل کا دل پسیج گیا اور وہ ان کے ساتھ اورنگ آباد چلے گئے اور کچھ مہینے بعد واپس اورئی آئے۔

عابد سہیل ریاضی میں بہت ہی کمزور تھے، اسکی وجہ سے انہیں اورئی میں کافی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اردو انہیں بہت آسان لگتی تھی اور انکے والد انہیں انگریزی پڑھاتے تھے اور ریاضی کے لئے مولوی خدا بخش کے یہاں جاتے تھے۔ عابد سہیل اپنے بارے میں لکھتے ہیں:

> ”میں پڑھنے لکھنے میں کچھ زیادہ دلچسپی لیتا نہ کوئی ایسا ذہن ہی تھا جس کی وجہ سے
> میرا شمار وسط درجے کے طالب علموں میں ہوتا لیکن فیل بھی کبھی نہیں ہوا۔“(۲۱)

ایک جگہ بتاتے ہیں کہ پونڈرک صاحب جو جغرافیہ پڑھاتے تھے، انہیں اردو نہیں آتی تھی، ششماہی امتحان

کی اردو کی کاپیاں پڑھنے کے لئے عابد سہیل کو گھر بلاتے ہیں اور کاپیوں سے جواب پڑھ کر پونڈرک صاحب کو سناتے ہیں تو وہ جتنے نمبر بتاتے ہیں، یہ سوال کے آخر میں لکھ دیتے تھے، کبھی وہ سوالات پر تبصرہ فرماتے اور اغلاط کی نشاندہی کرتے تھے چناچہ ایک دن عابد سہیل کی کاپی پر انھوں نے کوئی تبصرہ یا غلطی کی نشاندہی کی تو یہ اسے کاپی پر لکھنے لگے۔ انھوں نے لکھنے لئے منع کیا لیکن عابد سہیل نے بتایا کہ انکی ذاتی کاپی ہے تو وہ خاموش ہو گئے، اس کے بعد نمبر دینے میں تھوڑی بہت رعایت ضرورت برتی ہوگی۔

تاریخ اور جغرافی کے بارے میں عابد سہیل اور انکے ساتھی درجہ سے باہر آتے وقت یہ گنگناتے تھے۔

ہسٹری جاگرافی بڑی بے وفا
رات کو رٹی، صبح کو صفا
درجے میں گئے تو ماسٹر خفا
امتحان میں بیٹھے تو نمبر صفا (۲۲)

۱۹۴۷ء میں عابد سہیل کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا، اس وقت یہ نویں جماعت میں زیر تعلیم تھے۔ اس زمانے میں ایک روایت یہ تھی کہ نویں درجے کے امتحان میں اردو طلباء کو دس نمبر کا ہندی امتحان بھی پاس کرنا پڑتا تھا اور اسی طرح ہندی پڑھنے والوں کو اتنے نمبر کا اردو امتحان پاس کرنا ضروری تھا۔

عابد سہیل ہندی کی کتاب لے کر پنڈت جی کے پاس گئے تب پنڈت جی نے ایک پیراگراف پڑھنے کے لیے دیا لیکن عابد سہیل سے بمشکل پڑھا گیا تب پنڈت جی نے کہا:

> "درجے ملنے کے لئے یہ امتحان پاس کرنا لازمی نہ ہوتا تو میں تمہیں ایک بڑا سا شونیہ دے دیتا، جاؤ پاس کر دیا۔" (۲۳)

۱۹۴۸ء میں عابد سہیل نے ڈی-اے-وی۔ کالج اورئی سے ہائی اسکول پاس کیا۔ اس کے بعد لکھنؤ میں کرسچن کالج کامرس اسٹریم میں داخلہ لے لیا۔ وہاں پر اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی سرگرمیوں میں حصہ لیا، اس کے علاوہ ریلوے اسٹرائک کے معاملے میں جیل بھی گئے۔ حاضری کم ہونے کی وجہ سے اور پیسے کی دقت کی وجہ سے انٹرمیڈیٹ انھوں نے تین سال میں پاس کیا۔ اس بارے میں خود عابد سہیل لکھتے ہیں:

> "معلوم نہیں کیسے کامرس کا پہلا سال کر لیا۔ پہلے سال کے امتحان میں شاید تھیوری کا حصہ زیادہ تھا اور تھیوری تو خوب بگھار لیتا ہوں"۔ (۲۴)

۱۹۵۲ء میں لکھنؤ یونیورسٹی میں بی۔اے۔ میں داخلہ لیا اور یونیورسٹی جانے لگے۔ اس وقت اچاریہ نریندر

دیولکھنؤیونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔عابد سہیل نے اچاریہ نریندر دیو کا ایک واقعہ اس طرح لکھا ہے جس کو ان کے دوست لطیف صدیقی نے بیان کیا تھا:

”کانگریس نے اپنے اوادی اجلاس میں Socialistic pattern of Society کی تجویز منظور کی۔انھوں نے ایک نظریاتی بحث کوجنم دیا۔تھوڑے دنوں بعد نیشنل ہیرالڈ کے سینئر صحافی صلاح الدین عثمانی نے اچاریہ سے ایک انٹرویو میں اوادی ریزولوشن کا ذکر کیا تو انھوں نے براہ راست جواب دینے کے بجائے غالب کا یہ شعر پڑھا:

رگوں میں ڈوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے۔“(۲۵)

بی۔اے۔میں انھوں نے جن مضامین کا انتخاب کیا وہ معاشیات،انگریزی اور فلسفہ تھے۔فلسفے میں انہیں شروع سے ہی دلچسپی تھی،اسی وجہ سے انھوں نے فلسفے کا انتخاب کیا یہ گوتم بدھ کے فلسفے سے بہت متاثر تھے۔انھوں نے ایک وقت سوچا:

”میں نے ان دنوں میں،جب بدھ ازم سے بہت متاثر تھا کہ تعلیم ختم کرنے کے بعد بھکشو بن جاؤں گا۔پالی،پراکرت اور سنسکرت سیکھوں گا اور کمنڈل لے کر نکل جاونگا۔“(۲۶)

عابد سہیل نے اردو پہلے لی تھی جسکو معاشیات میں تبدیل کر دیا کیوں کہ اردو کی پہلی کلاس میں آل احمد سرور کو دیکھا تو بے ساختہ زبان سے نکلا۔

”اللہ اللہ یہ ہمیں اردو پڑھائیں گے۔“(۲۷)

عابد سہیل نے اگر مضمون تبدیل کرتے ہوئے اردو کی جگہ معاشیات نہ اختیار کیا ہوتا تو یہ سوال نہ بنتا کہ بی۔اے۔کتنے برس میں کیا جسکا جواب تھا پانچ سال میں مکمل ہوا۔

عابد سہیل نے بڑی پریشانیوں اور مصیبتوں میں تعلیم کو مکمل کیا کبھی کبھی وہ فیس جمع کرنے کے لئے جد جہد کرتے تھے اپنے امتحان کے بارے کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

”پرچا آیا جواب تو سارے سوالوں کے آتے تھے لیکن بس دوسطروں میں بہت

زیادہ کھینچتے تو چار پانچ جملے ہو جاتے۔ ہم دونوں (عابد سہیل اور شری چند) نے
مسکاوٹ کی اور ایک ہی طرح کے جواب لکھنے کا فیصلہ کرلیا، جیسے اکنامکس کا نہیں
فلسفے کا پرچہ کر رہے ہوں۔" (۲۸)

امتحان میں شری چند تو پاس ہو گئے لیکن عابد سہیل فیل ہو گئے۔" سانپ نکل چکا تھا اب لکیر پیٹنے سے کچھ حاصل نہ تھا۔"

عابد سہیل کو پہلے سال فیل ہو جانے اور دوسرے سال امتحان نہ دے سکنے کا غم تو تھا ہی لیکن اب دو سال گزر چکے تھے اور یہ صرف انٹر پاس تھے اور حالات اتنے خراب تھے کہ اوارگی میں زمانے کی سیر کرانے کے مواقع فراہم کر دئے لیکن جسم وجاں کا رشتہ قائم کرنے کے لئے ٹیوشن پڑھاتے رہے اور گھر گھر جا کر کتابیں فروخت کرتے رہے، اور یہی وجہ تھی کہ پڑھائی سے انکا رشتہ جڑا رہا۔ عابد سہیل لکھتے ہیں:

"کتابی دنیا کے اظہر صاحب نے دو روپے دیئے یہاں کاموں کا معاوضہ بھی ملتا
تھا، جیسے ہی جیب میں پیسے آئے، سیدھے پی پلس بک ہاؤس جا کر گور کی
کتاب ARTICLES AND PAMPHLETS ایک روپے چودہ
آنے میں خریدی۔ کتاب خریدنے کے بعد خیال آیا کہ صبح سے کچھ نہیں کھایا، سو
دو آنے کے چنے خریدے، جنہوں نے رات میں بھی ساتھ دیا"۔ (۲۹)

فلسفہ میں ایم اے کرنے کے بعد عابد سہیل ایک مقام پر رقمطراز ہیں:

"دبتا ہوا گندمی رنگ، اوسط سے ایک آدھ انچ چھوٹے قد اور شکل وصورت میں
کسی بھی قابل ذکر بلکہ پسندیدہ عنصر کی عدم موجودگی کے باوجود میں حاضر جوابی
، خوش مزاجی، کمیونسٹ، رجحان، کلاس میں مشکل سوال پوچھنے اور مشکل سوالوں کا
جواب دینے اور شرافت کی شہرت اور کچھ پوز کے سبب فلاسفی ڈپارٹمنٹ کا
مقبول ترین طالب علم تھا۔" (۳۰)

تعطیل کے بعد جب یونیورسٹی گئے تو درشن پریشد کی صدارت عابد سہیل کی منتظر تھی۔ صدارتی انتخاب میں کامیابی حاصل ہوئی۔ ایم۔ اے۔ کو دو سالوں میں سیکینڈ ڈیوژن میں مکمل کیا۔ اس وقت قومی آواز میں ملازمت انکا ذریعہ معاش تھا۔ لکھنے اور پڑھنے کا شوق انہیں وراثت میں ملا تھا۔ کالج میں الوداعی تقریب میں خود نوشت غزل سنائی جو ڈالی گنج پل سے ندوہ کی طرف جانے والی روڈ پر لکھی تھی، اس کے کچھ اشعار اس طرح ہیں:

منزلیں اور بھی دشوار ہوئی جاتی ہیں
کتنی دشوار ہوئی جاتی ہے ہر اک منزل
ہم تو بس ایک تمنا پہ جیے جاتے ہیں
کبھی انسان کا دیکھیں گے حسیں مستقبل (۳۱)

ایم ۔اے ۔کرنے کے بعد عابد سہیل کے استاد ڈاکٹر دیوراج نے انہیں Ph.D کرنے کا مشورہ دیا اور کہا "اے جے ایئر کے لاجیکل امپیریسزم" Logical Empiricism پر کام کرو۔انھوں نے رجسٹریشن کرالیا اور فیس کی پہلی قسط بھی جمع کر دی اور ڈاکٹر دیوراج کی نگرانی میں دو مرتبہ انہوں نے تحقیق کے لئے خاکہ تیار کیا لیکن وہ مسترد ہو گیا۔تیسری مرتبہ ڈاکٹر دیوراج نے خاکہ تیار کیا لیکن وہ بھی مسترد کر دیا گیا اور جو سوال پہلے ہوا تھا وہی اس بار بھی ہوا۔

At what Conclusion will you arrive at.

شعبہ فلاسفی کے صدر اس وقت کالی پرشاد تھے اور ان کا عابد سہیل کے تحقیقی خاکہ کو مسترد کرنا بلا وجہ نہ تھا، دو باتیں ایسی ہوئیں تھیں (سمپورن آنند اور مولانا آزاد والی) جس کی بنا پر وہ کافی ناراض تھے اور علاوہ بریں کالی پرشاد کے خلاف جو تحریک چلی انہیں اس بات کا گمان تھا کہ عابد کے پاس دو خطرناک خط ہیں، ان خطوں کی قیمت یونیورسٹی میں ملازمت اور دوسری طرف دس ہزار روپئے نقد کا وعدہ تھا۔

A University job is assured provided you prove yourself worthy of it."

Prove yourself worthy of it. کے معنی عابد سہیل نے سمجھ کے نہیں دیئے۔ یہ ان کی جرائت مندی اور حقیقت پسندی کا جیتا جاگتا ثبوت ہے، جو بعد میں ان کی ادیبانہ، شریفانہ شخصیت کی بنیاد بنی۔ بہر حال یہ دو جملے عابد سہیل کی شخصیت کی غمازی کرتے ہیں۔ عابد سہیل کی شخصیت کئی خوبیوں سے پر تھی۔ انھوں نے زندگی کے لمحات کو کبھی ضائع نہیں کیا۔ وہ ایک اعلیٰ اقدار اور کردار کے انسان تھے اور انسان دوست بھی تھے۔ کبھی کسی سے سخت وسست بات نہیں کرتے اور کوئی انکا مخالف بھی ہوتا تو صبر کرتے تھے۔ اسی بنا پر لوگ ان کے گرد جمع رہتے تھے۔ ان کی شخصیت کے بارے میں پروفیسر علی احمد فاطمی رقم طراز ہیں:

"اس شخص کے لیے بطور خاص جو خود بھی بڑا ہو، خاص طور پر ایک ایسے دور اور ماحول میں جہاں کوئی بھی چھوٹا ادیب و شاعر ہے ہی نہیں، اپنے آپ کو حقیر و معمولی کہنا اور دوسروں کو بڑا ثابت کرنا یہ۔۔۔ عابد سہیل ہی کر سکتے ہیں، جن

کے رگ و ریشہ میں وضعداری، خاکساری اور منکسر المزاجی پائی جاتی ہے اور
عابد سہیل کے ان اوصاف کے تو ان کے مخالفین بھی قائل ہیں"(۳۲)

عابد سہیل کی ابتدائی تعلیم سے لے کر پی ایچ ڈی کے رجسٹریشن تک کی مراحل کا تجزیہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ شروع سے ہی انہیں کسب علم کا بہت شوق تھا۔ حالات کی خستگی کے باوجود نہ انھوں نے ماہنامہ "کتاب" کے ساتھ رشتہ کو توڑا نہ ہی ملازمت کے نچلے درجے سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے میں کوئی عار محسوس کیا۔غربت اور افلاس انسان کو پریشان کرتے ہیں اور ترقی میں مانع بھی ہوتے ہیں لیکن عابد سہیل کے لئے ایسا کوئی معاملہ نہیں تھا وہ مسلسل اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھے۔اس سفر میں بیماریاں بھی آتی رہیں وہ بھی مہلک قسم کی لیکن یہ بھی انکے پائے استقامت پر اثر انداز نہ ہوئیں بلکہ انکا سفر اور تیز ہوا اور بلندیوں پر پہنچتے گئے۔

مختصراً سید محمد عابد کا تعلیمی سفر کا آغاز ہائی اسکول سے ۱۹۴۸ء ڈی-اے-وی کالج اورئی میں ہوا۔انٹرمیڈیٹ میں ۱۹۵۱ء کرسچن کالج ،لکھنؤ بی اے ۱۹۵۶ء لکھنؤ یونی ورسٹی ، ایم۔اے ۱۹۵۸ء لکھنؤ یونیورسٹی سے مکمل کیا۔بچپن سے ہی عابد سہیل کو کھیلوں کا رجحان تھا۔ساتھیوں کے ساتھ کھیلتے تھے۔اس وقت عمر پانچ برس یا اس سے کچھ زیادہ رہی ہوگی۔وہ ایک روز شام کے وقت گھر سے گیند لئے اس سے کھیلتے نکلے اور گیند کو دو چار ٹپے دئے۔رک کر گیند کو زمین پر زور سے مارا لیکن چشم زدن میں گیند نظروں سے اوجھل ہوگئی۔عابد سہیل نے گیند کو تلاش کیا لیکن نہیں ملی تلاش اب بھی جاری ہے کیونکہ یہ گیند کئی مہینوں کی محنت اور مشقت کے بعد بن سکی تھی۔ ایک جگہ گیند کے بارے میں لکھتے ہیں:

"کوئی مجھے میری وہ گیند ڈھونڈ کر لا دے۔"(۳۳)

اورئی میں کئی طرح کے کھیلوں کا رواج تھا، بارش کے موسم میں پتنگیں اڑانے کا ایک عام چلن تھا۔عابد سہیل کو بھی پتنگ اڑانے کا شوق پیدا ہوا لیکن وہ پتنگ اڑانا نہ سیکھ سکے۔عابد سہیل نے اس شوق کو پورا کرنے کے لئے ماہر پتنگ اڑانے والے کی مدد لی لیکن پتنگ کو چھت سے اونچا نہ اڑا سکے۔

جب اورئی کے ڈی-اے-وی-کالج میں زیر تعلیم تھے وہاں کے اساتذہ چھوٹے درجات کے طلبا کو ہاکی، فٹبال اور والی بال سکھاتے تھے، جسکو انھوں نے بہت شوق سے سیکھا اور اس میں مہارت حاصل کی-انہیں دنوں کالج کی سالانہ تقریب منعقد ہوئی اور عابد سہیل نے جذبہ اور جوش سے لبریز ہوکر اس میں شرکت کی۔اس سلسلہ میں خود لکھتے ہیں:

" میں تین چیزوں میں تھا ہاکی ، ڈبیٹ اور نمائش کے لئے بنائی جانے والی
چیزوں میں۔ ہاکی تو خیر میں کھیلتا ہی تھا اور کرکٹ بھی۔" (۳۴)

عابد سہیل کو کھیلوں سے دلچسپی وارثت میں ملی تھی کیونکہ انکے ابا صرف ہاکی ہی نہیں بلکہ کرکٹ بھی کھیلتے تھے۔ ہرڈل ریس میں انکا شمار بہترین کھلاڑیوں میں ہوتا تھا۔ سید ظفریاب حسن کلکٹریٹ کے اسپورٹس کلب کے صدر تھے، اور ہاکی ٹیم کے کپتان بھی۔ وہ سینٹر فارورڈ کی اپوزیشن میں کھیلتے تھے۔ ان کے یہاں کلکٹریٹ کی ہاکی اور کرکٹ کا کافی سامان رہتا تھا لیکن عابد سہیل کو انکے استعمال کی اجازت نہیں تھی۔ سید ظفریاب حسن نے ان کے لئے سامان خریدا، جس کا ذکر عابد سہیل اس طرح کرتے ہیں:

"انھوں نے مجھے دو اسٹیکس، کرکٹ اور ہاکی کی ایک ایک بال اور ایک بیٹ
خرید دیا تھا اور انہیں سے مجھے دونوں کھیلوں کا گر سکھاتے تھے۔" (۳۵)

عابد سہیل کے والد انہیں بہت چھوٹی چھوٹی باریکیاں بتاتیں تھے، بال کے بارے میں کچھ یوں فرماتے تھے۔

"اگر بیٹس مین کو اگلی بال کے بارے میں شک وشبہ میں نہ مبتلا کیا جائے تو اسے
آؤٹ کرنا مشکل ہے۔" (۳٦)

بیٹنگ کے سلسلے میں عابد سہیل اپنے والد کا نظریہ اس طرح بتاتے ہیں:

"ڈیڑھ گز پہلے تک آنکھ اور اس کے بعد سب کچھ تجربے اور اندازے پر منحصر
ہوتا ہے۔" (۳۷)

وہ گول کرنے کی مشق بہت ہی الگ انداز سے کرتے تھے، دو اینٹوں کو رکھ کر بال کو انکے درمیان سے نکالنے کے لئے کہتے ۔ انکی محنت اور عابد کی مشق کے نتیجہ میں انکا سلیکشن ڈی-اے-وی-کالج کی ہاکی ٹیم میں ہو گیا۔۔

عابد سہیل ہاکی کے اچھے کھلاڑی تھے لیکن اس سے کہیں بہتر کرکٹ کھیلتے تھے۔ محکمہ اطلاعات (یو-پی) کے ماتحت آنے والے اخبارات کی ٹیموں کے درمیان میچ ہوا، جس میں کپتان نے عابد سہیل کی پوزیشن وہاں رکھی جہاں فیلڈنگ میں زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے اور گیندز زیادہ آتی ہے۔ وہ ایک میچ کا حال بیان کرتے ہیں:

" ایک میچ جو وزیر اعلیٰ کی قیام گاہ کے سامنے لا ماٹینیئر گراونڈ میں پائینیر اور

> ہیرالڈ کے درمیان ہوا تھا، میں نے تین بالوں میں تین وکٹ لیے تھے اور میری
> اس ہیٹرک کی خبر اخباروں میں شائع ہوئی تھی اور انعامات ریاستی گورنر چنا ریڈی
> نے تقسیم کیے تھے۔" (۳۸)

عابد سہیل مشہور اخبار "نیشنل ہیرالڈ" کی کرکٹ ٹیم کے دو سال تک ایسوسی ایٹیڈ جرنلس ٹیم کے کپتان رہے۔ انہیں بچپن میں کشتی یا کسرت سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی لیکن خالہ زاد بھائیوں کو یہ کرتے دیکھا تو انہیں بھی شوق ہوا اور اپنے خالہ زاد بھائی سے مقابلہ کے لئے تیار ہو گئے۔ یہ خود دبلے پتلے آدمی جبکہ انکے بھائی کا جسم کسرت والا تھا لیکن عابد سہیل نے دو سے تین منٹ میں انکو پچھاڑ دیا۔ یہ جیت صرف ایک اتفاق تھی وہ خود لکھتے ہیں:

> "زندگی میں تھوڑی بہت کامیابیاں ملیں ان کی حیثیت بھی ایسی ہی ہے اور جہاں
> جہاں آنکھیں کھلی رہیں وہاں چت اور پٹ دوسروں کی رہیں۔" (۳۹)

عابد سہیل کے والد کا انتقال بھی ہاکی کے ایک میچ کے چند دنوں بعد ہی ہوا تھا، ان کے والد علیل تھے، سانس کا عارضہ ہو گیا تھا لیکن ان کے ساتھی بضد تھے کہ آپ گول کیپر کی پوزیشن پر کھیلے جبکہ انھوں نے کبھی گول کیپنگ نہیں کی تھی۔ عابد سہیل نے واقعہ نگاری کچھ یوں کی ہے:

> "مخالف ٹیم کا کھلاڑی گیند لے کر آیا اور آسانی سے گول کر کے چلا گیا، ابا دیکھتے
> ہی رہ گئے۔ انہیں مخالف ٹیم کو تھالی میں سجا کر گول پیش کر دینا اچھا نہ لگا اور انھوں
> نے گول کیپر کو اس جگہ بھیجا، خود اپنی سینٹر فارورڈ کی پوزیشن سنبھالی، بال اپنے
> قبضہ میں لی اور مخالف ٹیم کے ہر کھلاڑی کو جس نے گیند چھیننے کی کوشش کی،
> جھکائیاں دیتے ہوئے ڈی میں پہنچ کر شاٹ مارا جو گول میں تبدیل ہو گیا" قرض
> اتار دیا اب تم لوگ جانوں" کہتے ہوئے ابا میدان سے باہر نکل گئے۔"(۴۰)

عابد سہیل نے جب یونیورسٹی جانا شروع کیا تو یونیورسٹی بلڈنگ کے بجائے یونین بلڈنگ کا رخ کرتے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب کیرم کے تین ماہر کھلاڑی یونیورسٹی میں ہوا کرتے تھے۔ عارف نقوی، رئیس اور عابد سہیل۔ عارف نقوی شطرنج بھی بہت اچھا کھیلتے تھے اور عابد سہیل کیرم کے ماہر تھے، لیکن دونوں کے پاس کیرم خریدنے کے لئے پیسہ نہیں تھے۔ وہ دور کافی سخت تھا۔ الغرض اگر عابد سہیل کی زندگی کو بہ نظر غائر دیکھئے تو یہ بات روشن ہوتی ہے کہ عابد صرف ایک فن کے نہیں بلکہ بہ یک وقت کئی فنون سے واقف تھے، علمی صلاحیتوں کے ساتھ ان میں کئی طرح کی صلاحیتیں موجود تھی۔ جیسے کہ وہ تعلیمی سرگرمیوں کے علاوہ بچپن سے ہی کھیل میں بھی متحرک رہے ہیں۔

تعلیم ہر شخص کے لئے ناگزیر ہے کیونکہ تعلیم کے ذریعے انسان کی صلاحیت پروان چڑھتی ہے، جو افراد تعلیم حاصل کرتے ہیں وہ اپنی زندگی میں کامیاب ہوجاتے ہیں لیکن اس کے برعکس غیر تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے اپنی صلاحیتوں کو منظر عام پر لانا اوران سے خاطر خواہ فائدہ اٹھانا کافی دشوار ہوتا ہے، علم نہ ہونے کی بنا پر پسماندگی تو انسان کا تعاقب کرتی ہی ہے مگر خود انسان اپنے اندر کی کافی صلاحیتوں کو بروئے کار نہیں لا پاتا۔ تعلیم کا فائدہ صرف یہ ہی نہیں کہ اس سے اعلیٰ ملازمتیں حاصل ہوتی ہیں بلکہ تعلیم خود انسان کی شخصیت کو سنوارتی ہے۔

اورئی میں عابد سہیل پلے بڑھے لیکن اتنے بڑے بھی نہیں ہوئے کہ اپنی ماں کے اثر سے نکل جاتے۔ ان کی والدہ مسلم لیگ کی حمایتی تھیں اوران کے والد کانگریس کے۔ اورئی میں انھیں ''بچہ مسلم لیگ'' قائم کرنے کا خیال آیا۔ اس سلسلے میں ایک دو جلسے بھی ہوئے، جس میں شرکت کے لئے علی گڑھ سے نسیم قریشی تشریف لائے۔ دادا اور باپ کے رشتہ، اصول بندی، خود سے کام کرنے کا مزاج، محنت ومشقت اور ایمانداری یہ سب کچھ عابد سہیل نے اپنے اجداد سے سیکھا تھا۔ چونکہ زندگی پر باپ سے زیادہ دادا کا اثر تھا لہٰذا دادا کی رحلت کے بعد بھی وہ اثر دکھتا رہا۔ گھر کا ماحول خوشگوار اور علمی ہونے کی بنا پر تربیت اور تعلیم بہترین طریقہ سے ہوئی۔ اورئی جیسے مذہبی علاقہ میں شعر وسخن کا ماحول ملا جس کی بنا پر عابد سہیل کی اردو بہتر سے بہتر تر ہوگئی۔ بھوپال اور اورئی میں تعلیم حاصل کی جس کا ذہنی نشوونما میں اہم کردار رہا۔ ان کی زندگی میں ہزاروں ایسے واقعات ہیں، جن سے ان کی شخصیت متاثر ہوتی ہے۔ عابد سہیل کی باتیں فلسفیانہ ہوتی تھیں، ان کی تحریروں میں فکر انگیز جملے ملتے ہیں۔

ڈی۔ اے۔ وی۔ کالج اورئی کے چھوٹے درجات کے طلباء کے لئے ایک پروگرام رکھا گیا۔ اس پروگرام میں عابد سہیل شریک ہوئے اور انعام حاصل کیا۔ نیز کالپی میں ایک ادبی پروگرام میں شریک ہوئے وہاں بھی کامیاب رہے۔ اسی طرح کے ماحول میں ان کی ذہنی تربیت اور شعور کو پروان ملا۔ شعر وادب سے رشتے قائم ہونے لگے اوران کی شخصیت کی تکمیل ہوتی گئی۔

زندگی کے دیگر معاملات کی طرح ادبی معاملات بھی انتہائی نازک اور بڑے حیرت انگیز ہوتے ہیں، ان کو سمجھنے کے لئے محنت شاقہ کی احتیاج ہوتی ہے۔ اگر قاری با صلاحیت نہیں ہے تو معاملہ فہمی میں مشکلوں سے دوچار ہوتا ہے۔ عابد سہیل نے زندگی کی کشمکش کے باوجود محنت سے ادب پڑھا بھی لکھا بھی اور سمجھا بھی اور دنیائے ادب میں نام حاصل کیا۔

عابد سہیل کی حیات اسٹوڈنٹس کی حیثیت سے اور ایک ادیب کی حیثیت کئی سمتوں میں نظر آتی ہے۔ ان کی مختلف شہر مختلف مقامات مختلف ماحول میں گزری اور کافی جدوجہد کے ساتھ گزری۔ ان کے یہ الفاظ خود ان کی

شخصیت کی غمازی کرتے ہیں:

"میں عام طور پر جھوٹ نہیں بولتا، نقصان کا خطرہ مول لے کر بھی سچائی سے گریز نہیں کرتا۔ لیکن یہ بھی بتادوں کہ خاصا دبو قسم کا انسان ہو گیا ہوں اور صرف اپنی بزدلی کے سبب اس وقت بھی خاموشی اختیار کر لیتا ہوں جب لوگ جھوٹے دعوؤں میں مجھے اس طرح شامل کر لیتے ہیں گویا میں ان سب کا گواہ ہوں۔ میں ہمیشہ ایسا نہ تھا۔ ابا کے انتقال سے قبل خاصا دبنگ تھا، لیکن بعد کے حالات اور ایک حادثے نے جس کی تفصیلات بھی اپنی بزدلی کے سبب بیان نہیں کر سکا ہوں، تباہ کر دیا۔ تاہم ان حالات سے مجھے فائدہ بھی ہوا۔۔۔ گھنٹوں سر جھکائے کام کرتا رہتا ہوں، سہولت نے مجھے صحافتی دنیا میں ایک اچھا نہیں تو محنتی اور بھروسے کے قابل کارکن ضرور بنا دیا اور چھوٹا موٹا ادیب بھی۔" (۴۱)

انسان کی زندگی میں بار بار مختلف مواقع ایسے آتے ہیں، جہاں اسے بہت سے اچھے اور برے فیصلے لینے پڑتے ہیں، جس میں اس کی مدد تعلیم کی روشنی کرتی ہے۔ اس کے علاوہ تعلیم کے حصول کے بعد انسان میں سنجیدگی، بردباری، تہذیب اور ثقافت جیسی چیزیں آتی ہیں۔

عابد سہیل "ماہنامہ کتاب" کے اداریے میں شخصیت سے متعلق لکھتے ہیں کہ:

"ہر ادیب اور شاعر انسان بھی ہے، کسی خاندان میں، کسی علاقہ میں، کسی ملک میں پیدا ہوا ہے، کسی ماحول میں (پسندیدہ یا ناپسندیدہ) زندگی بسر کرتا ہے کسی مذہب، تہذیب اور عقیدے سے دلچسپی بھی لے سکتا ہے، زندگی بسر کرنے کے لئے کوئی پیشہ بھی اختیار کر سکتا ہے اور اس پیشہ کی وجہ سے اس کے سوچنے، سمجھنے، لکھنے، پڑھنے پر کچھ خاص اثرات بھی پڑ سکتے ہیں، اس صورت حال میں یا تو وہ اپنی شخصیت کو کئی خانوں میں تقسیم کر دے اور جب ادیب شاعر ہو تو کچھ اور نہ ہو یا پھر وہ اپنے اندر ہر پہلو کو سمجھ کر ایک گتھی ہوئی شخصیت کی صورت میں اپنے کو پیش کرے۔ یہ مسائل بھی جدید نفسیات اور عمرانیات میں برابر زیر بحث آتے رہتے ہیں اور آج کا ادیب اپنے متعلق غور کرتے ہوئے اپنی ذات کی کھوج کرتے ہوئے انھیں نظر انداز نہیں کر سکتا۔" (۴۲)

عابدسہیل افلاس وغربت کو مفلسی کا تاشہ مانتے ہیں اور ایک یادگار واقعہ اپنی خودنوشت میں لکھتے ہیں، چند جملے ملاحظہ ہو:

"قسمت جب خاندانوں کو بانٹنا چاہتی ہے تو عجب کھیل کھیلتی ہے۔اس طرح کے جب کھیل بگڑتے ہیں تو نیک ارادے اپنا منھ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔" (۴۳)

اور پھر یہ جملے:

"ان دنوں ہم لوگ ایک ایک پیسے کے محتاج تھے۔" (۴۴)

ایک طرف یہ حقیقت دوسری طرف عزت نفس، رشتہ داری ووضعداری اورئی اور بھوپال کی پرانی تہذیب، وضع قطع اس دھند میں، ایک ایسی تہذیب اور فکرابھرتی ہے، جوان کے قلب وجگر میں سرایت کرجاتی ہے بالخصوص زوال پذیر صورت اور صبر واستقلال کی کیفیت جس نے عابدسہیل کی شخصیت کی تعمیر میں اہم رول ادا کیا ہے۔عابد سہیل جس دور کی شخصیت ہیں وہ دور سیاسی انتشار کا دور تھا، ہر طرف ایک افراتفری کا عالم تھا لہٰذا وہ بھی سیاسی سرگرمیوں میں شامل ہوگئے لیکن قدرت نے انھیں سیاست کے لئے نہیں ادب کے لیے پیدا کیا تھا۔ان کا دل ایک شاعر کا، ایک ادیب کا اور ایک آرٹسٹ کا دل ہے۔ادبی نشستوں میں ادبی وفنی محاسن پر بحث ہوتی اور بہترین طریقہ سے بات ہوتی ہے۔نہ مساعد حالات نے عابدسہیل کے اوپر کافی اثر ڈالا جوانکے قلم پر بھی منعکس ہوا۔اس کے باوجود تخلیقات کا کام جاری رہا اور اردو ادب کی تحریک کو اپنے فن کے ذریعہ تقویت پہنچائی۔عابدسہیل جس وقت کرسچن کالج میں زیر تعلیم تھے۔اس زمانے میں رشید کوثر ان کے دوست بن گئے۔رشید کی صحبت نے انھیں شاعر بنا دیا۔عابد کی پہلی اور نامکمل نظم اس طرح ہے:

وہ التفات کے اگلے چراغ کیوں ہیں بجھے
نیاز وناز کے پہلے سے دور کیوں نہ رہے
کہ جیسے چاند چمکتا ہو بادلوں کے پرے
ستارے پھر کوئی رنگین سا فسانہ دوست
مچل مچل کے ہے کشمیر عشق فریادی
بہار ہی ہے سہیل اشک دل کی آزادی
سنادے پھر کوئی رنگین سا فسانہ دوست۔۔(۴۵)

ادبی منظرنامے پر انکا قد کافی بلند ہے۔انھوں نے نہ صرف اردو بلکہ دیگر ہندوستانی زبانوں کی خدمت کی

اوراس میں نئے نئے فکری اورفنی بلندی ایجاد کی۔ادب میں مواد، موضوع اورتکنیک کے نئے تجربات خودبھی کئے اور دوسرے ادیبوں سے بھی یہ خدمات انجام دینے کی طرف متوجہ کیا۔مراٹھی ، ہندی ، انگریزی کہانیوں کو اردو قالب میں دھالا ، اگر یہ کہا جائے کہ عابد سہیل کے قلم سے نکلے ہوئے موتی ادبی دنیا کے لئے سرمایہ ہیں تو یہ بات حق بجانب ہوگی۔

اسٹوڈنٹس فیڈریشن اورکمیونسٹ تحریک عابد سہیل کا نا قابل فراموش کارنامہ ہے۔اس تحریک کے ذریعہ انھوں نے ادب ، سیاست ،صحافت ،تہذیب وثقافت کے میدان میں قابل ذکر تبدیلیاں پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کی۔انکی بے پناہ ذہانت ،آگاہی ،صبر واستقامت کی بنا پر ان کی تحریک کامیاب رہی۔مشہور افسانہ نگار رتن سنگھ نے عابد سہیل کی شخصیت کی غمازی ان الفاظ میں کی ہے:

”سر کے بال سفید ،لیکن پوری طرح اپنی جگہ پر کیا مجال کہ ایک بھی بال ادھر ادھر ہو جائے ، ابھرا ہوا ماتھا ، ذہانت کی علامت ، چمکدار آنکھیں ، جیسے دور اندھیروں کے بھید کو دیکھنے کی کوشش کر رہی ہوں ، چوڑا چہرہ سخت سے سخت حالات کا مقابلہ کرنے کی عکاسی کرتا ہو۔صاف ستھرے کالر کے نیچے ٹائی کی مضبوط گانٹھ جیسے خود کو گلے سے باندھ کر لمحوں کو گرفت میں لینے کی کوشش کر رہے ہوں۔ چوڑے کندھوں پر گہرے رنگ کا کوٹ تا کہ کوئی چاہے بھی تو ان کی شخصیت کی تھہ تک نہ پہنچ سکے۔“ (۴۶)

عابد سہیل کی شخصیت کی تشکیل وتکمیل میں اس دور کے حالات کا بہت بڑا رول رہا ہے،اس دور کے سیاسی ، سماجی ، معاشی حالات نے ہر انسان کو متاثر کیا پھر یہ تو ایک حساس دل کے مالک تھے۔ وہ کیوں نہ متاثر ہوتے ، جیسے جیسے وہ شعوری اعتبار سے بڑے ہوتے گئے وہ اپنے گردونواح کے ساتھ عالمی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں کا محاسبہ کرنے لگے۔سماجی نابرابری ظلم واستبداد کے خلاف احتجاج بھی کرتے رہے۔سنجیدگی کی بنا پر ادبی ماحول نے ان کی فکر کو وسعت پیدا کردی۔اپنے ملک کی فلاح وبہبود کے لئے کارنامے انجام دیئے ایک جگہ خود لکھتے ہیں:

”میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار ایک مقصد پایا ، پھر ایک ایسے راستے پر چل نکلا ، جو ساری زندگی ساتھ رہا ، یہاں آکر فکر کا وہ پہلو دل ودماغ پر روشن ہوا ، جس نے دوسروں کے دکھ درد اور محرومیوں کو سمجھنا ، اپنے بس بھر ان کے لئے کچھ کرنا ، ان کے غموں میں شامل ہونا ، غیر ضروری دولت کی جانب حقارت کا رویہ بھی

زندگی کے کڑے کوس آسان ہو گئے، اسی نظریے کی دین ہے۔" (۴۷)

عابد سہیل کی شخصیت کی خصوصیات نے انھیں اختلافات کی سرحدوں سے اوپر کر دیا۔ ادبی حلقوں خصوصا ترقی پسند اور دوسرے حلقوں میں انکی رائے کو اہمیت حاصل تھی۔ چھوٹے بڑے سب انکا بہت احترام کرتے، انکے عادات واطوار کو دیکھتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انکا خمیر شبنم سے گوندھا گیا ہو۔ اودھ نامہ کے ۹ اگست ۲۰۱۴ء کے اداریے میں عابد سہیل کے بارے میں فیاض رفعت لکھتے ہیں:

"عابد سہیل کی شخصیت میں کئی شخصیتیں آباد ہیں، وہ اپنے اظہار و بیان میں فلسفی بھی ہیں، دانشور بھی ہیں، وہ اپنے اظہار و بیان میں فلسفی بھی ہیں، دانشور بھی ہیں، فسانہ گو بھی ہیں، انھوں نے خاکہ نگاری بھی کی ہے، کتاب جیسے رسالے کی تیرہ برس تک ادارت بھی کی ہے۔ کتابوں کا کاروبار ان کے شوق فراواں کا ایک حصہ رہا ہے، جسے ہم کاروبار تمنا سے بھی معنون کر سکتے ہیں۔ انھوں نے بے شمار نئے ادیبوں کو نہ صرف اپنے موقر صحیفے کتاب کے ذریعہ متعارف کرایا، ان کی کتابیں چھاپ کر زیاں کا سودا بھی کیا۔ ایک ادیب کے طور پر ان کی شخصیت کی بوقلمونی اور نیرنگی پر آج کی محفل میں جو تبصرے ہوئے، انھوں نے سامعین کے دلوں کو روشنی سے بھر دیا۔ عابد سہیل نے غم دوراں کو اس طرح برداشت کیا زندگی کی دشوار راہیں آسان ہوتی چلی گئیں۔ کیا یہ کم بات ہے کہ وہ ایک ثروت مند ادیب ہیں، کیا یہ افتخار کی بات نہیں کہ ادب کے ساتھ ساتھ صحافت کی دنیا میں بھی انھوں نے نشان امتیاز قائم کیا۔" (۴۸)

عابد سہیل ایک بہترین انسان، ایک بہترین ادیب اور ایک تنظیم کار کی حیثیت سے بھی مشہور ہیں اور وہ مدیر، نصرت پبلشرز کے مالک بھی رہے۔ وہ بیک وقت دوست، استاد، ہم سفر، رہبر اور ایک بزرگ بھی تھے، ان کی شخصیت مختلف پہلوؤں سے مل کر بنی ہے۔

عابد سہیل نے اپنی کچھ نظموں اور غزلوں میں ظفر یاب تخلص استعمال کیا ہے اور کہیں کہیں عابد ظفر یاب بھی لکھتے تھے۔ عابد سہیل کا باقاعدہ ادبی سفر تو افسانوں سے شروع ہوتا ہے۔ ان کا پہلا افسانہ" دور آسمان کی خلاؤں میں" دیوان سنگھ مفتوں کے مشہور ہفت روزہ" ریاست" کے ۱۵ اگست ۱۹۴۹ء کے خاص نمبر میں شائع ہوا تھا۔ لیکن یہ ان کی پہلی تحریر نہیں تھی اس سے پہلے وہ ریڈیو کے لیے تحریریں، ریڈیائی ڈرامے، اسکرپٹ اور آج کل، نیا دور

اوراخبارات میں کالم وغیرہ بھی لکھتے رہے۔

ملازمت

عابد سہیل کی زندگی میں بہت سے پیچ وخم دیکھنے کو ملتے ہیں۔ والد کے سایہ عاطفت سے محروم ہوجانے کے بعد انہیں کئی طرح کی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا جن میں سے ایک مالی پریشانی یا تنگدستی کا مسئلہ بھی تھا۔افراد خاندان کے ساتھ اپنے ذاتی خرچے مثلاً تعلیم وغیرہ پورے کرنے کے لئے انہوں نے سڑک کے کنارے کتابیں بیچیں، ٹیوشن پڑھایا اور رکشا بھی چلایا حالانکہ اس آخرالذکر پیشے کو شاذ و نادر ہی انجام دیا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آذوقہ حیات کی فراہمی کے لئے عابد سہیل نے صحافت کو بطور پیشہ اختیار کیا۔اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بچپن سے ہی ان کو صحافت سے دلچسپی تھی۔ ۱۹۵۲ء میں عابد سہیل قومی آواز کے اعزازی نامہ نگار (برائے یونیورسٹی) بنائے گئے یہ انتخاب عشرت علی صدیقی نے کی مرہون منت تھا۔یونیورسٹی کی نامہ نگاری کے بارے میں وہ لکھتے ہیں

> قومی آواز نے اسی سال یعنی جب میں نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا مجھے اعزازی نامہ نگار مقرر کر دیا تھا۔ یونیورسٹی میں ہنگامے شروع ہوئے تو مقامی اور قومی اخباروں کے نمائندوں میں میری اہمیت یکا یک بڑھ گئی لکشمی کانت تواری، ودیا ساگر، سپرو، ایس۔ایم۔جعفر اور دوسرے سینئر رپورٹروں کے لئے سارا دن یونیورسٹی میں گذارنا ممکن نہ تھا۔ وہ شام میں آتے اور میں دن بھر کی سرگرمیوں سے انھیں مطلع کر دیتا۔ اسٹوڈینٹس فیڈریشن سے میرے تعلق اور اخباری نمائندوں کو دن بھر کی خبریں دینے کے سبب سی۔آئی۔ڈی نے میری گرفتاری کی ایک سازش رچی۔ واضح کردوں کہ اس وقت اور بعد میں بھی میری اپنی کوئی اہمیت نہ تھی لیکن پولیس سمجھتی تھی کہ اخباروں کے مخالفانہ رویے کا ذمہ دار میں ہی ہوں، کیونکہ انھیں خبریں مجھ سے ملتیں" (۴۹)۔

۱۹۵۷ء میں قومی آواز کے سب ایڈیٹر بنائے گئے جہاں وہ حیات اللہ انصاری سے آشنا ہوئے۔اس ملازمت کے لئے عابد سہیل کو منظر سلیم قومی آواز لے گئے تھے۔عابد سہیل لکھتے ہیں

"ایک دن منظر سلیم سے ۔۔۔ پل جھاؤلال پر ملاقات ہوگئی۔۔۔ دونوں ایک

دوسرے کو دیکھ کر اپنی اپنی سائیکل سے اتر پڑے سرک کے کنارے کھڑے
ہوکر باتیں کرنے لگے۔

گفتگو کا آغاز منظر بھائی نے ہی کیا
"قومی آواز میں نوکری کیجئے؟
"مجھے مل جائے گی؟"
"آپ کو نہیں ملے گی تو کس کو ملے گی؟" انھوں نے جواب دیا۔(۵۰)"

قومی آواز کے بعد عابد سہیل نیشنل ہیرالڈ پہنچ گئے۔ وہاں ان کا تقرر ایم۔سی نے کیا تھا۔ واقعہ کچھ اس طرح تھا کہ عابد سہیل آل انڈیا ریڈیو پر مباحثوں کے مقابلے میں لکھنؤ یونیورسٹی کی قیادت کر رہے تھے۔ اس مقابلہ میں ملک بھر کی یونیورسٹیز کی ٹیموں نے حصہ لیا تھا۔ فائنل مقابلہ دلی میں ہوا تھا جس میں عابد سہیل کی زیر قیادت لکھنؤ ٹیم کو فتح ملی تھی۔ اشوکا ہوٹل کی ایک پارٹی میں اس فتح پر عابد سہیل کو ایم سی نے مبارکباد دی۔ یہ ان کی پہلی ملاقات تھی۔ جب وہ دلی سے واپس آئے تو چلپت راؤ نے عابد سہیل کو بلایا اور اپنے ساتھ کام کرنے کی تجویز پیش کی۔ عابد سہیل نے یہ تجویز قبول کر لی لیکن چھ مہینے بعد پوری طرح سے نیشنل ہیرالڈ منتقل ہوئے کیونکہ حیات اللہ انصاری نے انھیں اسٹاف کی عدم موجودگی کی بنا پر روک لیا تھا۔

اس کے بعد اخبار" پائینیر" میں بھی انھوں نے اپنی خدمات انجام دیں۔ ۱۹۹۰ میں وہ روزنامہ صحافت لکھنؤ کے خصوصی مشیر مقرر ہوئے اور تین سال اداریے بھی لکھے۔ ۱۹۹۸ سے لیکر ۲۰۱۰ تک مشہور اخبار دی ٹائمس آف انڈیا میں ہفتہ وارا کالم اردو پریس کے نام سے لکھتے رہے۔ انھوں نے اپنا صحافتی سفر ۱۹۵۲ء سے شروع کیا۔ ۲۰۱۰ تک جاری رہا، اتنے سالوں میں انھوں نے بے شمار ادبی، سیاسی اور صحافتی مضامین لکھے۔ یہ مضامین مختلف اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوئے، ان میں زیادہ تر لکھنؤ کے اخبار ہی ہوتے تھے۔

عابد سہیل نے" قومی آواز"،" نیشنل ہیرالڈ"،" پائنیر" اور" ٹائمس آف انڈیا" جیسے بڑے بڑے اخبارات کے ذریعہ زندگی کے ہزاروں پہلو دیکھے، بے شمار مشاہدے کئے اور سبق آموز تجربوں سے ہمکنار ہوئے۔ اپنے ارد گرد ادیبوں اور دانشوروں کا ایک تابناک حلقہ قائم کیا، وہ ایک کامیاب اور سلجھے ہوئے صحافی تھے۔ ان کا مزاج شائستہ تھا۔ صحافت کی دنیا میں انھوں نے کمیونسٹ صحافی کے عنوان سے قدم رکھا۔ عابد سہیل نے ۱۹۶۲ء میں ماہ نامہ "کتاب" کا اجراء کیا اس کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں تخلیق کو اہمیت دی جاتی تھی خواہ وہ کسی مشاق ادیب کی ہو یا میدان ادب میں کسی تازہ قدم رکھنے والے کی تخلیق ہو۔

رتن سنگھ کے خیال میں:

”عابد سہیل کی شخصیت کا ایک پہلو اور بھی ہے اور وہ ہے روزنامہ قومی آواز کی نوکری اور پھر وہاں سے جست لگا کر نیشنل ہیرالڈ میں پہنچنا اور پھر اس سے بھی زیادہ اہمیت رکھتی ہے، کتاب جیسے ادبی جریدے کی ادارت۔“ (۵۱)

۱۹۷۲ء میں نیشنل ہیرالڈ کے چیف ایڈیٹر اور ۱۹۸۲ء میں نیوز ایڈیٹر بنے لیکن ۱۹۸۵ء میں چند وجوہات کی بناء پر استعفاء دیا۔ کچھ ہی عرصہ بعد ۱۹۹۰ء روزنامہ صحافت میں خصوصی مشیر معین ہوئے۔ ساتھ ہی انگریزی اخبار ”ٹائمس آف انڈیا“ کے لئے اردو پریس کے عنوان سے ہفتہ وار کالم لکھنے لگے جس کا سلسلہ ۲۰۱۰ تک جاری رہا۔

لکھنؤ کی ادبی سرگرمیاں

۱۹۴۷ء میں والد کے راہی ملک عدم ہو جانے کے بعد اور ہائی اسکول مکمل کرنے کے بعد عابد سہیل نے انٹر میڈیٹ اور اعلیٰ تعلیم کے حصول کی غرض سے لکھنو کا رخ کیا۔ اور اپنی زندگی کا ایک طویل اور اہم حصہ لکھنؤ میں ہی گزارا۔

’ہائی اسکول پاس کر کے لکھنو آیا اور پھر یہیں کا ہو رہا‘‘ (۵۲)

لکھنو کے شروعاتی دور میں عابد سہیل نے اپنے ماموں کے یہاں رہائش اختیار کی جو میونسپل انسپکٹر تھے۔ لکھنؤ آنے سے پہلے عابد سہیل اپنے بھائی بہنوں اور والدہ کے ساتھ کچھ دن اپنے چچا کے یہاں محی الدین پور میں بھی قیام پذیر رہے لیکن ان کی والدہ بچوں کی تعلیم کو لے کر فکرمند تھیں اس وجہ سے وہاں نہیں رہنا چاہتی تھیں۔ اسی سبب انھوں نے لکھنو کو ہی رہائش گاہ کے عنوان سے فوقیت دی:

”گرمیوں کی چھٹیوں میں یتیمی کی ردا اوڑھ کر میں، اماں اور چھوٹے بھائی بہن کے ساتھ پہلی بار محی الدین پور گیا تو نواب چچا کا رویہ بہت اچھا تھا۔ پہلے وہ مجھے عابد کہتے تھے لیکن اب ’’عابد میاں‘‘ کہہ کر پکارتے، چھوٹے بھائی عمران اور چھوٹی بہن نجمہ کو بھی بہت پیار کرتے۔ ان کا اصرار تھا کہ اماں اور ہم لوگ اب وہیں رہیں لیکن بچوں کی تعلیم کے پیش نظر اماں گاؤں میں نہیں رہنا چاہتی تھیں۔‘‘ (۵۳)

لکھنؤ آ کر عابد سہیل ایک نئی دنیا سے روشناس ہوئے۔ یہاں کالجز کے استاد، یونیورسٹیز کے پروفیسر، ترقی پسند تحریک کے سرگرم اراکین کے علاوہ وسائل اور دستیابی میں بھی بہت وسعت پیدا ہوائی۔ یہی عابد سہیل نے اپنی غزل کہی اور یہیں اپنا پہلا افسانہ لکھا۔ اس شہر نے انھیں روزگار مہیا کیا اور روزگار کے ذریعہ لکھنے کا وسیع میدان بھی۔

یہاں کے رسالوں اور ریڈیو میں وہ اپنی تخلیقی کاوشوں کو شائع اور نشر کرتے ، آمدنی کے ساتھ ساتھ ان کی شہرت بھی ہوتی۔ وہ لکھتے ہیں

پھر ایک دروازہ کھلا ۔ یہ ۱۹۵۲ کی بات ہے۔۔ جب ریڈیو کے ڈراموں اور فیچروں میں حصہ لینے کے لئے میری آواز منظور ہوئی۔"(۵۴)

اس کے علاوہ نیا دور، آجکل وغیرہ رسالوں میں وہ لکھتے اور اس آمدنی سے کاروبار حیات رواں دواں رہتا۔

"بچوں کے مضامین یا کہانیوں کے لئے "نیا دور" سے دس روپئے اور" آجکل" سے پندرہ روپئے ملتے ۔(۵۵)

لکھنؤ یونیورسٹی میں اسٹوڈنٹس فیڈریشن سے وابستگی اور ترقی پسند تحریک سے تعلق نے انھیں نظریوں پر قائم رہنا سکھایا مگر اس کی پاداش میں انھیں جیل بھی جانا پڑا۔ ان سب کے درمیان لکھنؤ میں انھیں جو شناخت ماہنامہ "کتاب" کے ذریعہ ملی اس نے ان کے قد کو ادبی دنیا میں کافی اونچا کر دیا۔ ۱۹۶۲ ء میں عابد سہیل نے ماہنامہ کتاب نکالنا شروع کیا۔ عابد سہیل کو کتاب سے بڑا لگاؤ تھا۔ اس کے متعلق قاضی عبدالستار لکھتے ہیں:

''عابد سہیل کی بیگم کو عابد سہیل کے کسی دوست کے بجائے کتاب سے شکایت رہتی ہے۔ اس لیے کہ عابد سہیل نے کتاب کو گود لے رکھا ہے، اور وہ اسے اپنی اکلوتی بیٹی پر فضیلت دیتے ہیں، کیا کیا جائے ہماری سوسائٹی میں جہاں اور بہت سی خامیاں ہیں ایک یہ بھی ہے کہ لڑکے کو لڑکی پر ترجیح دی جاتی ہے۔ لڑکا آخر بڑھاپے کا سہارا بھی تو ہوتا ہے۔ لیکن کتاب تو عابد سہیل کی جوانی کو گھن کی طرح لگ گیا۔''(۵۶)

ماہ نامہ "کتاب" میں جن ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات منظر عام پر آئیں ان میں لئے جانے والے ناموں میں سے حیات اللہ انصاری، گیان چند جین، شمس الرحمان فاروقی، عابد سہیل، قرۃ العین حیدر، نیر مسعود، عرفان صدیقی، علی عباس حسینی، شارب ردولوی مسعود حسن رضوی ادیب، سید احتشام حسین علی سردار جعفری، محمد حسن، ڈاکٹر خورشید الاسلام، ڈاکٹر ربیع الزماں، ڈاکٹر محمود الہی، اکٹر قمر رئیس خلیل الرحمن اعظمی، سلام مچھلی شہری شہر یار، بشیر بدر، حسن کمال، ندا فاضلی قاضی عبدالستار، اقبال متین سر بندر پرکاش، اقبال مجید، جوگندر پال، بلراج کومل، عبدالصمد، احمد یوسف، جیلانی بانو، غیاس احمد گدی اور جون ایلیا، وغیرہ اہم نام ہیں۔ قاضی عبدالستار کا ناول دارا شکوہ پہلی مرتبہ

ماہنامہ کتاب میں ہی قسط وار شائع ہوا۔اس کے علاوہ رسالے نے خاص اور ضخیم اشارے بھی شائع کئے۔جس میں افسانہ نمبر علی عباس حسینی نمبر، شوکت تھانوی نمبر، ہندی کہانی نمبر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ساتھ ہی اس رسالے میں عابد سہیل کی ترقی پسند ادبی تحریک سے نسبت ہونے کے باعث انجمن کے جلسوں کی روداد بھی شائع ہوتی تھی لیکن عابد سہیل کی طرح اس رسالے نے بھی کسی مخصوص نظریے کا ترجمان یا نقیب بننا منظور نہیں کیا اور بڑی سادگی اور حسن خوبی سے ادب کی ابلاغ و تفہیم اور تعبیر و تفسیر کے فرائض انجام دیتا رہا اور ادبی دنیا کو نئے افسانہ نگاروں سے روشناس کراتا رہا۔ عابد سہیل لکھتے ہیں پچھلی صدی کے ۷۰ ویں اور ۸۰ ویں دہے کے دوران افسانہ نگاروں کی جس نسل نے اپنے بیانیہ کو چمکا کر شہرت پائی اس میں سے بیشتر کی پہلی تخلیقات یا وہ جن سے ان کی شناخت قائم ہوئی ”کتاب“ میں شائع ہوئے۔کتاب کی اشاعت کا سلسلہ تیرہ برسوں تک مسلسل جاری رہا اور مسلسل خسارے میں رہنے کے باعث اسے ۱۹۷۵ء میں بند کرنا پڑا۔اس کی سب سے بڑی وجہ تھی کہ ادارے نے کسی سے مالی امداد بھی قبول نہ کی۔حقیقت یہ ہے کہ عابد سہیل کو کسی کے سامنے دست نیاز دراز کرنا پسند نہ تھا۔نیشنل ہیرالڈ کی مستقل بدحالی اور ماہنامہ کتاب کے بند ہو جانے کے بعد عابد سہیل نے اپنی بیوی کے نام سے لکھنؤ کے امین آباد میں نصرت پبلشرز کا آغاز کیا لیکن حقیقت کچھ اور رہی ہے جس کو خود عابد سہیل نے اپنی خودنوشت میں اس طرح تحریر کیا ہے:

> ”مولوی سعید کی گرفتاری کا تعلق کسی نہ کسی طرح جبل پور کے فسادات سے تھا لیکن ان فسادات کا ابھی ایک حوالہ باقی ہے۔مائل ملیح آبادی ان دنوں کمیونسٹ پارٹی میں تھے۔ان کا ناول ”برف کی دیوار“ جبل پور کے فسادات کے پس منظر میں لکھا گیا تھا۔اور اس میں کمیونسٹ پارٹی کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ کی آنچ بھی تھی۔یو۔پی میں جن سنگھ مارکہ کانگریس کی حکومت تھی۔اس نے ناول ضبط کرلیا لیکن مقدمہ نہیں چلایا مشہور تھا کہ حکومت جانتی ہے کہ مقدمہ چلایا تو ضبطی بھی عدالتی چھان پھٹک میں مسترد ہو جائے گی کسی طرح کتاب کی اس ضبطی کی آنچ پارلیمنٹ تک پہنچی اور دہلی میں اس کی تلاش شروع ہوئی۔پابندی لگتے ہی میں نے ایک رات لکھنؤ میں موجود ساری کتابیں رکشے میں لا دیں اور انھیں گومتی برد کر دیا۔باقی کتابیں دہلی میں ایک جگہ تھیں جو میری خواہش کے مطابق ردی میں بیچ دی گئیں۔پابندی لگتے ہی کتاب کی مانگ میں زبردست اضافہ ہو گیا،اس حد تک کہ دہلی کے ایک غیر مسلم پبلشر نے غیر مجلد کتابیں بھی چالیس فی صد کمیشن پر خریدنے کی پیش کش کر دی۔مسروقہ بوسے کی طرح چوری چھپے بکنے

والی چیز گراں قدر ہو جاتی ہے۔ ان دنوں مشہور یہ بھی تھا کہ بعض ادارے تو
کوشش کر کے اپنی کتابوں پر پابندی لگواتے ہیں۔ واللہ علم۔ میں نے تو پابندی
لگنے کے بعد کتاب کی ایک جلد فروخت نہ کی۔ سرکاری سطح پر دہلی اور لکھنو میں
کتاب کی تلاش خاصی تاخیر سے شروع ہوئی اور کہیں ایک کاپی نہ ملی۔ ایک دن
شام کے وقت چار پانچ لوگ آئے۔ وہ ''برف کی دیوار'' کی ایک کاپی چاہتے
تھے۔ میرے پاس کتاب کی ایک بھی جلد نہ تھی۔ میں نے معذرت کی تو وہ بضد ہو
گئے کہ آپ نے چھاپی ہے، تلاش کیجیے ایک آدھ تو مل ہی جائے گی۔ جب وہ کسی
طرح میری بات ماننے کے لیے تیار نہ ہوئے تو میں نے گھر کی ساری چابیاں ان
کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا کہ ہمیں ایک ضروری کام سے جانا ہے آپ کتاب
تلاش کر لیں اور جاتے وقت چابیاں سامنے والے گھر میں دے دیں۔ مایوس
ہوکر وہ لوگ چلے گئے۔ ان کا تعلق ایل۔ آئی۔ یو۔ (لکھنو انٹلی جنس یونٹ) سے
تھا۔ یہ بات انھوں نے شروع ہی میں بتادی تھی۔ یہ اس دن کی بات ہے جب
برجو مہاراج رو بیندرالیہ میں غالب بیلے پیش کرنے والے تھے اور ہم لوگ
رویندرالیہ جانے کے لیے تیار۔ اس واقعے کے بعد میں نے ادارے کا نام نصرت
پبلشرز کر دیا۔ نصرت میری اہلیہ کے نام کا ایک حصہ ہے۔" (۵۷)

مولوی سعید سے عابد سہیل کی ملاقات رام لعل نے کرائی تھی۔ مولوی سعید نے اپنی ٹریول ایجنسی کے کچھ اشتہارات بھی ماہنامہ کتاب کو دیے تھے۔ مگر کچھ زمانے بعد معلوم چلا کہ مولوی سعید نامی شخص جبل پور فسادات کے سلسلہ میں مطلوب تھا اور اب وہاں جیل میں ہے۔ "برف کی دیوار" ناول مائل ملیح آبادی کا تھا جسے جبل پور فسادات کے پس منظر میں لکھا گیا تھا اس کی اشاعت کتاب پبلشر نے کی تھی جس کے سبب عابد سہیل بڑی مشکل میں گرفتار ہو گئے اور بعد میں انھوں نے "کتاب پبلشر" کو "نصرت پبلشر" میں منتقل کر دیا

تصنیف وتالیف کی ابتداء

عابد سہیل نے جوانی کے دور سے لکھنا شروع کر دیا تھا جس کی ابتدا انھوں نے اپنے ایک انگریزی کے مضمون سے کی جو حکومت اتر پردیش کے انگریزی ترجمان 'اتر پردیش' مین شائع ہوا تھا اس وقت عابد سہیل انٹر میڈیٹ کے طالب علم تھے۔ پھر اس سلسلہ میں عمر کے ساتھ اضافہ ہوتا گیا اور ۱۵ اگست ۱۹۴۹ء میں ان کا پہلا افسانہ 'دور آسمان کی خلاؤں میں' دیوان سنگھ مفتوں کے ہفت روزہ 'ریاست' کے ذریعہ منظر عام پر آیا۔

افسانوں کی پہلی باقاعدہ کتاب ۱۹۷۵ء میں منظر عام پر آئی جس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۴ء کو شائع ہوا۔ ایک سیمینار بعنوان: اردو کے ادبی رسالوں کے مسائل میں پڑھے جانے والے مضامین کو ترتیب دیا جو کتابی شکل میں اردو اکادمی لکھنؤ سے ۱۹۸۱ء میں شائع ہوئی۔ ۱۹۸۸ء میں مزاح نگار احمد جمال پاشا کے مضامین کا انتخاب کیا جو اردو اکادمی لکھنؤ نے ۱۹۸۸ء میں شائع کیا۔ 'جینے والے' دوسرا افسانوی مجموعہ ۱۹۹۸ء میں شائع ہوا۔ 'فکشن کی تنقید: چند مباحث' ۲۰۰۰ء میں منظر عام پر آئی اور اس کا دوسرا ایڈیشن ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا۔ نیشنل بک ٹرسٹ نے لئیق فتح علی کی کتاب Garden کا ترجمہ کرنے کے لئے عابد سہیل سے درخواست کی جس کو قبول کرتے ہوئے عابد سہیل نے باغات کے علم پر مشتمل ایک معلوماتی کتاب اردو ادب کے حوالے کی۔ ۱۵ خاکوں پر مشتمل کتاب 'کھلی کتاب' ۲۰۰۴ء میں شائع ہوئی۔ عابد سہیل کی تیسرا اور آخری افسانوی مجموعہ 'غلام گردش' ۲۰۰۶ء میں شائع ہوا۔ ایچ جی ویلز کے ناول دی انویزیبل مین کا ترجمہ کیا جو ۲۰۰۶ء غیر مرئی انسان کے عنوان سے شائع ہوا۔ ڈاکٹر عبدالعلیم کا مونوگراف ہندوستانی ادب کے معمار سیریز کے تحت ۲۰۰۸ میں تصنیف کیا اسی سال ۲۰۰۸ء میں عابد سہیل نے 'عبدالعلیم کی منتخب تحریریں' ترتیب دیں جسے نیشنل بک ٹرسٹ نے شائع کی۔ رحمن رنگ کے عنوان سے عابد نیشا پوری کے دوھے ترتیب دیے جسے کاکوری پریس لکھنؤ نے ۲۰۰۹ء میں شائع کیا۔ ایک سو ایک مختلف دانشوروں، فلسفیوں اور مفکر حضرات کے اقوال (اقوال زریں) کو حرف کائنات کے عنوان سے جمع کیا جس میں انگریزی اقوال کے ترجمے عابد سہیل نے کئے، اسے تخلیق کار پبلی شرز دہلی نے ۲۰۱۰ء میں شائع کیا۔ علیم شناسی جس میں عابد سہیل نے وہ مضامین جمع کئے ہیں جو انھوں نے ڈاکٹر عبدالعلیم پر اہل قلم سے لکھوائے تھے، اس کی اشاعت ۲۰۱۲ء میں ہوئی۔ اسی سال یعنی ۲۰۱۲ء میں عابد سہیل کی سب سے زیادہ مقبول ہونے والی کتاب 'جو یاد رہا' (خود نوشت) شائع ہوئی جو تقریباً ۷۰۰ صفحات پر محیط ہے۔ ایک کتاب 'درد کا شجر' (محبت کی کہانیاں) قومی اردو کاؤنسل برائے فروغ زبان اردو کے مالی تعاون سے ۲۰۱۲ء ہی میں شائع ہوئی جس میں عابد سہیل نے کہانیوں کا ترجمہ اور انتخاب کیا ہے۔ اسی سال ۲۰۱۲ء یں عبدالعلیم کے مضامین جن کو عابد سہیل نے جمع کیا تھا دو جلدوں میں

مرتب کے مقدمہ کے ساتھ قومی کاؤنسل نے شائع کیا۔عابد سہیل کے خاکوں کی دوسری کتاب پورے آدھے ادھورے جس میں ۲۵ خاکے شامل ہیں ۲۰۱۵ء میں شائع ہوکر مقبول ہوئی۔" افسانیات ان کی آخری کتاب ہے، جسے پس مرگ ان کی اہلیہ انیس نصرت نے ۲۰۱۷ میں شائع کیا۔اس کتاب میں عابد سہیل کی مختلف تحریریں شامل ہیں۔مشہور ادیب وصحافی عابد سہیل کو ان کی زندگی میں بہت سے انعام واکرام اور اعزازات سے نوازا گیا ہے، اس میں ان کی تصانیف پر انعام بھی شامل ہیں۔اس کی تفصیل اس طرح ہے۔

(۱) مولانا آزاد نیشنل ایوارڈ، یوپی اردو اکادمی ۲۰۱۱۔۲۰۱۲

(۲) نیشنل ایوارڈ آف اردو کانفرنس، سولاپور (مہاراشٹر) ۲۰۱۱ء

(۳) فرسٹ تھری ایئر نیشنل فیلوشپ، دہلی اردو اکیڈمی ۲۰۰۸ء

(۴) اردو نثر، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی ۲۰۰۵ء

(۵) لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ، یوپی اردو اکادمی ۱۹۹۵ء

(۶) میر اکادمی ایوارڈ ۱۹۸۵ء

عابد سہیل کی زندگی مختلف شعبوں سے وابستہ رہی اور اکثر تو یہ وابستگیاں ایک ہی وقت میں تھیں۔اتنے محاذ پر ذمہ داری کے ساتھ آگے بڑھتے رہنا ان کی محنت اور سوجھ بوجھ کو عیاں کرتا ہے۔اس طرف اشارہ کرتے ہوئے پروفیسر شارب ردولوی نے اپنے مضمون میں لکھا ہے

عابد سہیل ایک ذمہ دار صحافی، ایک اہم ادبی مدیر، ایک محقق افسانہ نگار اور فکشن ناقد ہیں۔میں نے ان تمام خصوصیات کا ایک سانس میں ذکر کر دیا حالانکہ انھوں نے ان شعبوں میں نہ صرف یہ کہ کچھ کام کیا ہے بلکہ اپنی حیثیت کو منوایا ہے۔ڈاکٹر عبدالعلیم کے گم شدہ مضامین کی تلاش وجستجو، اس کی ترتیب وتحشیہ معمولی کام نہیں تھا، نہ نیشنل ہیرالڈ اور ٹائمس آف انڈیا کی ادارت سے وابستگی معمولی کام تھا۔ان سے تربیت حاصل کرنے والے صحافی آج بھی ان کی مہارت کا دم بھرتے ہیں۔(۵۸)

حواشی

۱۔"جو یادرہا" عابد سہیل، اردو اکادمی دہلی، 2012ء ص:669

۲۔ایضاً ص:666

۳۔ایضاً ص 124

۴۔"جو" جو یادرہا" عابد سہیل، اردو اکادمی دہلی، 2012ء ص:131

۵۔"جو یادرہا" عابد سہیل، اردو اکادمی دہلی، 2012ء ص:158

۶۔"جو یادرہا" عابد سہیل، اردو اکادمی دہلی، 2012ء ص:669

۷۔"جو یادرہا" عابد سہیل، اردو اکادمی دہلی، 2012ء ص:30

۸۔"جو یادرہا" عابد سہیل، اردو اکادمی دہلی، 2012ء ص:672

۹۔(جو یادرہا، عابد سہیل، اردو اکادمی دہلی ۲۰۱۲، صفحہ ۵۲)

۱۰"جو یادرہا" عابد سہیل، اردو اکادمی دہلی، 2012ء ص:158

۱۱۔"جو یادرہا" عابد سہیل، اردو اکادمی دہلی، 2012ء ص:161

۱۲۔"جو یادرہا" عابد سہیل، اردو اکادمی دہلی، 2012ء ص:161

۱۳۔"جو یادرہا" عابد سہیل، اردو اکادمی دہلی، 2012ء ص:86

۱۴۔"جو یادرہا" عابد سہیل، اردو اکادمی دہلی، 2012ء ص:86

۱۵۔مضمون "عابد سہیل کی کہانی" از رتن سنگھ "اودھ نامہ" لکھنؤ 8 اگست 2014ء

۱۶۔"جو یادرہا" عابد سہیل، اردو اکادمی دہلی، 2012ء ص:359

۱۷۔"جو یادرہا" عابد سہیل، اردو اکادمی دہلی، 2012ء ص:360

۱۸۔اودھ نامہ، علی گڑھ 28 جنوری 2016ء ص:7

۱۹۔"جو یادرہا" عابد سہیل، اردو اکادمی دہلی، 2012ء ص:32

۲۰۔"جو یادرہا" عابد سہیل، اردو اکادمی دہلی، 2012ء ص:74

۲۱۔"جو یادرہا" عابد سہیل، اردو اکادمی دہلی، 2012ء ص:107

۲۲۔"جو یادرہا" عابد سہیل، اردو اکادمی دہلی، 2012ء ص:108

۲۳۔"جو یادرہا" عابد سہیل، اردو اکادمی دہلی، 2012ء ص:109

۲۴۔"ایوان اردو"، جون 2013ء، ص:12

۲۵۔"جو یادرہا" عابد سہیل، اردو اکادمی دہلی، 2012ء ص:281

۲۶۔"مری سرشت میں ہے انتظار موسم گل" (مضمون) علی احمد فاطمی، رسالہ "ایوان اردو"، جون 2013ء ص:14

۲۷۔"جو یادرہا" عابد سہیل، اردو اکادمی دہلی، 2012ء ص:285

۲۸۔"جو یادرہا" عابد سہیل، اردو اکادمی دہلی، 2012ء ص:287

۲۹۔"جو یادرہا" عابد سہیل، اردو اکادمی دہلی، 2012ء ص:302

۳۰۔"جو یادرہا" عابد سہیل، اردو اکادمی دہلی، 2012ء ص:328

۳۱۔"جو یادرہا" عابد سہیل، اردو اکادمی دہلی، 2012ء ص:368

۳۲۔"مری سرشت میں ہے انتظار موسم گل" (مضمون) علی احمد فاطمی، رسالہ "ایوان اردو" جون 2013ء ص:18

۳۳۔"جو یادرہا" عابد سہیل، اردو اکادمی دہلی، 2012ء ص:31

۳۴۔"جو یادرہا" عابد سہیل، اردو اکادمی دہلی، 2012ء ص:149

۳۵۔"جو یادرہا" عابد سہیل، اردو اکادمی دہلی، 2012ء ص:158

۳۶۔"جو یادرہا" عابد سہیل، اردو اکادمی دہلی، 2012ء ص:158

۳۷۔"جو یادرہا" عابد سہیل، اردو اکادمی دہلی، 2012ء ص:158

۳۸۔"جو یادرہا" عابد سہیل، اردو اکادمی دہلی، 2012ء ص:199

۳۹۔"جو یادرہا" عابد سہیل، اردو اکادمی دہلی، 2012ء ص:161

۴۰۔"جو یادرہا" عابد سہیل، اردو اکادمی دہلی، 2012ء ص:161

۴۱۔ایوان اردو، اردو اکادمی، دہلی، جون 2013ء ص:9

۴۲۔"ماہنامہ کتاب" لکھنؤ، مراٹھی کہانی نمبر شمارہ جون 1968ء، ص:4

۴۳۔"جو یادرہا" عابد سہیل، اردو اکادمی دہلی، 2012ء ص:78

۴۴۔"جو یادرہا" عابد سہیل، اردو اکادمی دہلی، 2012ء ص:79

۴۵۔"جو یادرہا" عابد سہیل، اردو اکادمی دہلی، 2012ء ص:208

۴۶۔ایوان اردو، اردو اکادمی، دہلی، جون 2013ء ص:6

۴۷۔"مری سرشت میں ہے انتظار موسم گل" (مضمون) علی احمد فاطمی، رسالہ "ایوان اردو"، جون 2013ء ص:12

۴۸۔اودھ نامہ، لکھنو 28 جنوری 2016ء ص:4 (ادارتی صفحہ)

۴۹۔"جو یادرہا" عابد سہیل، اردو اکادمی دہلی، 2012ء ص:289

۵۰۔ایوان اردو، اردو اکادمی، دہلی، جون 2013ء ص:18

۵۱۔("جو یادرہا" عابد سہیل، اردو اکادمی دہلی، 2012ء صفحہ 331)

۵۲"جو یادرہا" عابد سہیل، اردو اکادمی دہلی، 2012ء ص:154

۵۳۔"جو یادرہا" عابد سہیل، اردو اکادمی دہلی، 2012ء ص:189

۵۴۔ایضاً صفحہ 303

۵۵۔ایضاً 304
۵۶۔"اردو میں رپورتاژ نگزری" عبدالعزیز، ساقی بک ڈپو، لکھنؤ، 2005ء ص:228
۵۷۔"جو یادرہا" عابد سہیل، اردو اکادمی دہلی، 2012ء ص:449-448
۵۸۔عابد سہیل، صبیحہ انور (مرتبہ) اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، 2019)

دوسرا باب

اردو میں غیر افسانوی نثر کا ارتقا عابد سہیل کے عہد تک

الف: اردو کی پہلی نثری تصنیف

ب: اردو غیر افسانوی نثر کا فروغ

ج: ترقی پسند عہد اور غیر افسانوی ادب